المنار
جلد نمبر 3
شمارہ نمبر 4
اپریل 2024
مجلس طلبائے قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کا علمی اور ادبی مجلّہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس شمارے میں

پتہ برائے خط وکتابت

editorAlmanar@gmail.com

Click Here to visit TICAA USA **Website**

Click her to visit us on **facebook**

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۭ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۭ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۶۵

اور یہود نے کہا اللہ کا ہاتھ بند کیا ہوا ہے۔ خود انہی کے ہاتھ بند کئے گئے ہیں اور جو انہوں نے کہا اس کے سبب سے ان پر لعنت ڈالی گئی ہے۔ بلکہ اُس کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔ وہ جیسے چاہے خرچ کرتا ہے۔ اور وہ جو تیری طرف تیرے ربّ کی طرف سے اتارا گیا ان میں سے بہتوں کو بغاوت اور انکار میں یقیناً بڑھادے گا۔ اور ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیے ہیں۔ جب بھی وہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اسے بجھا دیتا ہے۔ اور وہ زمین میں فساد پھیلانے کے لئے دوڑے پھرتے ہیں۔ اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (5:65)

حضرت ابوسعید بن معلیؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سنو میں مسجد سے نکلنے سے پہلے تمہیں قرآن کی سب سے بڑی سورۃ بتاؤں گا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم (مسجد سے) نکلنے لگے تو میں نے آپؐ کو یاد دلایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی (ہر قسم کی) تعریف کا اللہ (ہی) مستحق ہے (جو) تمام جہانوں کا ربّ (ہے۔) یہی سات دوہرائی جانے والی (آیات) اور قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔

(بخاری كِتَاب تَفْسِيرِ الْقُرْآنِ بَابُ قَوْلِهِ: وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ)

محترم پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد خان صاحب المعروف پرویز پروازی وفات پا گئے

اناللہ وانا الیہ راجعون

آپ مایہ ناز ماہرِ تعلیم، اردو کے قادر الکلام شاعر، اعلیٰ پائے کے نقاد، انشا پرداز اور مصنف تھے

(ابو سدید)

احبابِ جماعت کو بہت دکھ اور افسوس کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ جماعت احمدیہ کے اردو کے معروف شاعر، ادیب، مصنف اور مایہ ناز ماہرِ تعلیم محترم پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد خان صاحب المعروف پرویز پروازی مورخہ ۲۸/ ستمبر بروز جمعرات ۲۰۲۳ء بعمر ۸۷ سال کینیڈا میں بقضائے الٰہی وفات پا گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آپ نے ایک لمبا عرصہ بیماری میں گزارا۔ آپ محترم مولانا احمد خان صاحب نسیم (مبلغ سلسلہ) کے بیٹے، مولانا محمد احمد جلیل صاحب کے داماد اور محترم مولانا نسیم مہدی صاحب مرحوم (مبلغ سلسلہ) کے بھائی تھے۔

آپ کا اصل نام ناصر احمد خاں تھا جبکہ قلمی نام پرویز پروازی استعمال کرتے تھے اور اسی نام سے دنیائے ادب اور تعلیم کے میدانوں میں پاکستان اور پھر بیرون پاکستان مشہور ہوئے۔ آپ ۲۰ / اکتوبر ۱۹۳۶ء کو قادیان میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ربوہ میں مقیم ہو گئے۔ جون ۱۹۵۶ء میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔ اور ۱۹۵۸ء میں بی اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶۰ء میں ایم اے، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے پاس کیا۔

آپ نے سلسلۂ تدریس کا آغاز ۱۹۶۰ء میں گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ سے کیا۔ ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۹ء تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں بطور لیکچرار پڑھاتے رہے۔ پھر ترقی حاصل کر کے بطور پروفیسر ۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۵ء تعلیم الاسلام کالج میں ہی تدریس کی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۹ء آپ وزیٹنگ پروفیسر اوساکا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز جاپان رہے۔ ۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۲ء انٹر کالج کمالیہ میں اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر تدریس کا کام کیا۔ ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۶ء مسلم انٹر کالج چک ۱۴۱ ج۔ ب فیصل آباد میں اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔ ۱۹۸۶ء تا ۱۹۹۰ء بطور اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں پڑھایا۔ ۱۹۹۱ء تا ۲۰۰۱ء پروفیسر ریسرچ ایٹ اپسالا یونیورسٹی سویڈن میں خدمات انجام دیں۔

آپ کی متعدد تصنیفات اور تالیفات منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

☆ ...۱۹۶۴ء۔ ذکرِ اردو، تعلیم الاسلام کالج کی پہلی کل پاکستان اردو کانفرنس کے مضامین کا مجموعہ

☆ ...۱۹۷۷ء۔ خوبصورت جاپان اور میں، کاواباتا یاسوناری کی نوبیل تقریر کا اردو ترجمہ

☆ ...۱۹۷۸ء یوکی گونی، کاواباتا کے ناول کا اردو ترجمہ

☆ ...۱۹۸۰ء۔ جاپان کا سب سے لمبا دن

☆ ...۱۹۸۰ء۔ جاپان کی ہائیکو شاعری کا انتخاب اور ترجمہ

☆ ...۱۹۸۱ء۔ سورج کے ساتھ ساتھ، جاپان کا سفر نامہ

☆ ...۱۹۹۷ء۔ صدائے آب، ہائیکو پر تنقیدی مضامین

☆ ...۲۰۰۲ء۔ آکی مے، ہیروشیما کے المیہ کے پس منظر میں ناول

☆ ... ۲۰۰۳ء۔ احمدیہ کلچر

☆ ... ۲۰۰۳ء۔ سر ظفر اللہ کا تحریکِ آزادی میں حصہ

☆ ... ۲۰۰۳ء۔ پس نوشت۔ اردو کی خود نوشت سوانح عمریوں کا جائزہ

☆ ... ۲۰۰۵ء۔ سر ظفر اللہ کی یادداشتیں

☆ ... ۲۰۰۶ء۔ Reminiscences of Sir ZafarUllah

☆ ... ۲۰۰۸ء۔ پس نوشت اور پسِ پسِ نوشت (مزید خود نوشت سوانح عمریوں کا تجزیہ)

☆... ۲۰۱۰ء۔ پس نوشت سوم (مزید خود نوشتوں کا جائزہ)

آپ کا حاصل عمر "حبل الورید" قرآن کریم کا اردو ترجمہ (غیر مطبوعہ) ہے۔ خود نوشتوں کے تجزیے کا کام آپ نے آخر تک جاری رکھا۔ آپ پاکستان سے تیسری ہجرت کے بعد ۲۰۰۳ء سے کینیڈا میں مقیم رہے۔ آپ بذلہ سنج اور مرنجان مرنج طبیعت کے حامل اور بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ دورِ طالبعلمی سے لے کر آخر عمر تک اپنے دوستوں، قریبیوں اور رشتہ داروں میں ہر دلعزیز رہے۔ جس محفل میں ہوتے صاحبِ محفل ہوتے۔ کالج کے اسٹیج پر ہوتے یا بعد میں کسی تقریب میں آپ کا طرزِ خطابت منفرد ہوتا۔ ساتھی طلبہ کو آپ کی ڈیبیٹ کا اچھوتا انداز بہت پسند تھا جس کی وجہ سے آپ جہاں بھی جاتے اور مقابلوں میں حصہ لیتے وہاں سامعین آپ کے منتظر ہوتے۔

آپ بہت ہمدرد اور پیار کرنے والی شخصیت تھے۔ دوستوں کے دوست اور غمخوار بھی تھے۔ خلافتِ احمدیہ سے ہمیشہ وابستہ رہے اور خوب فیض بھی پایا۔ ایسی نستعلیق شخصیت اور نایاب لوگ دیکھنے کو بہت کم ملتے ہیں۔ آپ کی وفات کے ساتھ ترقی پسند اردو ادب اور منفرد انداز کا درس و تدریس کا ایک شاندار دور اختتام کو پہنچا۔ دنیا بھر میں آپ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ آپ اردو کا گہرا ذوق رکھنے والے قیمتی سرمایہ تھے اس سلسلہ میں آپ کی خدمات یاد رکھی جائیں گی۔

آپ کے لواحقین میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے، مغفرت کی چادر میں لپیٹ لے، اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے۔
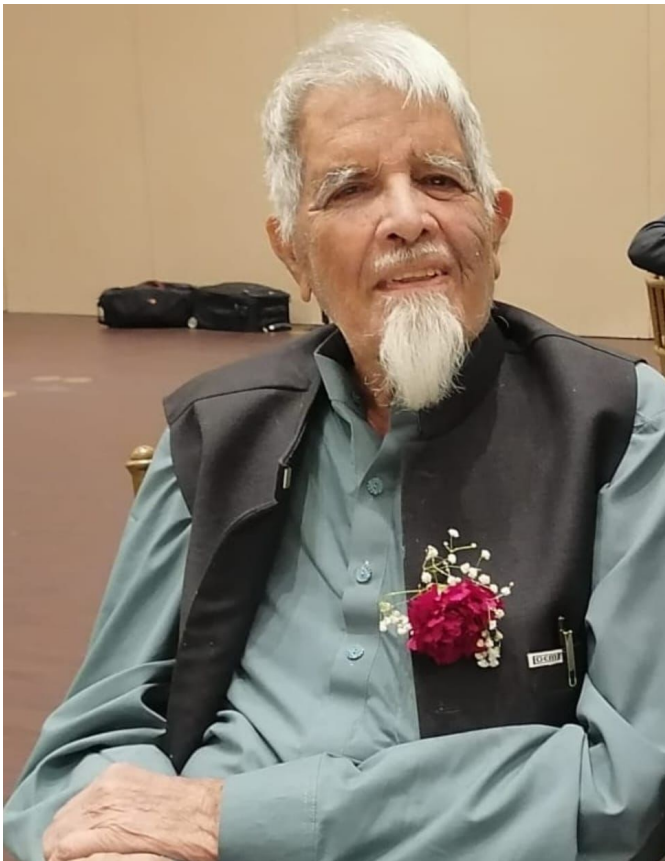
سفیر رامہ

محترم پروفیسر محمد شریف خان صاحب کے علمی اور تحقیقی کاموں کا مختصر جائزہ

تعلیم و تدریس:

- محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد شریف خان صاحب نے 1963 میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے زوالوجی میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ انہیں ایم ایس سی کے فائنل امتحان میں اول آنے پر سر ولیم رابرٹس گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔
- آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے ہی زوالوجی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔
- 1963 میں زوالوجی کے لیکچرار کے طور پر تعلیم الاسلام کالج، ربوہ میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور 1999ء میں زوالوجی کے پروفیسر اور شعبہ کے سربراہ کے طور پر ریٹائر ہوئے۔

تحقیق و تفتیش:

- محترم ڈاکٹر شریف خان صاحب نے پاکستان میں Herps (سانپ، مینڈک اور چھپکلیاں) کے مطالعہ کی اسوقت بنیاد رکھی جب پاکستان میں اس حوالے سے علم تقریباً صفر تھا۔

- اس موضوع پر ان کا پہلا تحقیقی مقالہ 1965ء میں شائع ہوا۔
- انہوں نے پاکستان کے تقریباً ہر کونے میں جاکر Herps کی مختلف اقسام کو جمع کیا اور ریکارڈ کیا۔ اور ہر ایک قسم کا تعارف کروایا۔
- آپ نے Herps کی 34 نئی اقسام کو دریافت کیا جن میں 11 سانپ، 15 چھپکلیاں اور 8 مینڈک شامل ہیں۔
- آپ نے دنیا بھر کے مختلف سائنسی جریدوں میں 250 سے زیادہ تحقیقی مقالے شائع کیے۔

کُتب:

محترم ڈاکٹر شریف خان صاحب نے انگریزی، اردو اور جرمن زبانوں میں پاکستان کے مینڈکوں اور رینگنے والے جانوروں پر 10 کتابیں تصنیف کیں۔

- *Amphibians and Reptiles of Pakistan*. Krieger Publishing Company, Melbourne, Florida, USA, 2006
- *Die Schlangen Pakistans*, Bucher-Kreth GmbH, Frankfurt, Germany, 2002.
- *The Snakes of Pakistan*, Bucher-Kreth GmbH, Frankfurt, Germany, 2002.
- *A field guide to the identification of Herps of Pakistan*. Part-I: Amphibia. Biological Society of Pakistan, Lahore 1987
- A *field guide to the identification of Herps of Pakistan*. Part-II: Chelonia, Biological Society of Pakistan, Lahore, 1990.
- Venomous Terrestrial Snakes of Pakistan and Snake bite problem, In: *Snakes of medical importance* (Asia-pacific region), pp. 419-446, P. Gopalakrishnaconc and L.M. Chou (eds). National University of Singapore 1990.
- Endangered species of reptiles of Pakistan and suggested conservation measures, pp. 42-45, In: Handbook published to mark second seminar on "*Nature Conservation and Environmental Protection,*" 12 March 1991, Islamabad, Wildlife Conservation Foundation, Islamabad.
- پاکستان کے مینڈک اور رینگنے والے جانور، اردو سائنس بورڈ، لاہور 2000
- پاکستان کے سانپ، اردو سائنس بورڈ، لاہور
- پاکستان کی جنگلی حیات کتاب میں باب 'مینڈک، چھپکلیاں، کچھوے اور سانپ'، اردو سائنس بورڈ، لاہور 1991

دیگر خدمات:

ڈاکٹر خان نے ڈبلیو ڈبلیو ایف پاکستان اور پاکستان سائنس فاؤنڈیشن کے ساتھ مختلف تحقیقی منصوبوں پر کام کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اور امریکا منتقل ہونے کے بعد، انہوں نے اپنے تمام جمع شدہ مینڈکوں اور رینگنے والے جانوروں کا مجموعہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور کے قدرتی

تاریخ کے میوزیم کو عطیہ کر دیا۔ امریکا میں ریٹائرڈ زندگی گزارنے کے دوران بھی پہلے کی طرح فعال رہے اور پاکستان، ایران اور دوسرے ممالک کے طلبہ کی رہنمائی اور ان کے تحقیقی مقالات و تھیسز کی نگرانی کرتے رہے۔

ایوارڈز:

- ایم ایس سی میں میرٹ کے مطابق پہلے نمبر پر آنے کے لیے "سر ولیم رابرٹس گولڈ میڈل" سے نوازا گیا۔
- 2002 میں "زولوجسٹ آف دی ایئر" کا ایوارڈ پاکستان زولوجیکل سوسائٹی کی طرف سے دیا گیا۔
- 2013 میں زولوجیکل سوسائٹی آف پاکستان کی طرف سے "لائف اچیومنٹ ایوارڈ دیا گیا۔

ڈاکٹر عبدالکریم خالدؔ

استاذ الاساتذہ۔ڈاکٹر پرویز پروازی

۱۹۶۸ء میں میٹرک کرنے کے بعد جب میں پروازی صاحب کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوا تو ان پر عین جوانی کا عالم تھا۔نہایت وجیہہ، دراز قد، فرنچ کٹ ڈاڑھی، سر کے بال نفاست سے ترشے سنورے ہوئے، کاٹن کی اچکن زیب تن کیے ہوئے، سیاہ فریم کی عینک لگائے ایک ادائے بے نیازی سے خرام کرتے تو انہیں دیکھنے اور دیکھتے رہنے کو جی کرتا اور جب کلام کرتے تو پھر وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ گفتگو میں کوئی اُن کے سامنے ٹِک ہی نہیں سکتا تھا۔ شگفتگی، تازگی اور گاہے مزاح کی چاشنی اُن کی باتوں کا حسن تھا۔ ان کی باوقار اور پرکشش شخصیت کا ہو بہو عکس میرے دھیان میں ابھی تک موجود ہے۔میں انہیں جانے پہچانے راستے پر چلتے ہوئے اب بھی دیکھتا ہوں، جہاں سے گزر کر وہ کالج پہنچتے تھے۔ ریلوے لائن کے متوازی راستے پر پیدل چلتے ہوئے وہ کالج کے پچھلے دروازے سے داخل ہوتے اور سائیکل اسٹینڈ کے قریب سے برآمدے کی دو سیڑھیاں چڑھ کے اپنے کمرے تک پہنچتے۔ ان کا مختصر سا کمرہ کالج کی عمارت کے پچھلے حصے میں آخری سرے پر تھا جس میں ان کی نشست کے پہلو میں دو تین کرسیاں لگی ہوئیں جن پر ہم طالب علم یا ان کے ملنے والے بیٹھتے تھے۔

ایسا بھی ہوتا کہ وہ سیدھے چلتے ہوئے کلاس میں آجاتے۔ اردو کی کلاس کالج کے کشادہ ہال میں ہوتی جہاں انٹر میڈیٹ کے تمام سیکشنوں کے طلباء جمع ہو کر اُن کی آمد کے منتظر ہوتے۔ اُن کی تشریف آوری سے پہلے روسٹرم پر مائک لگا ہوتا۔ ہر طالبعلم کی یہ کوشش ہوتی کہ وہ وقت سے پہلے ان کی کلاس میں موجود ہو۔ تاخیر سے آنے والا یا تو ہال سے باہر ہی کھڑا رہتا یا اندر آنے کی صورت میں نتائج کا خود ذمہ دار ہوتا۔ عین وقت پر پروازی صاحب سٹیج کے بغلی دروازے سے ہال میں داخل ہوتے اور ہم سب ان کے احترام میں کھڑے ہو جاتے۔ وہ سیدھے روسٹرم پر تشریف لاتے اور کچھ دیر خاموش کھڑے رہتے اور جب چھوٹی چھوٹی آوازیں آنا بند ہو جاتیں اور ایک گھمبیر خاموشی طاری ہو جاتی تو ان کی آواز اس سکوت کو توڑتی۔ نہایت آہستگی اور دھیرج سے لیکچر کا آغاز کرتے۔ دھیرے دھیرے آواز بلند ہوتی جاتی۔ شاعری کی قرات بہت عمدہ، شعر دل میں اُترتے چلے جاتے۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

آدھا مطلب شعر خوانی ہی میں سمجھا دیتے اور جب شعر کی تشریح و توضیح کرتے تو مفاہیم پہلو بدل بدل کر سامنے لاتے۔ حقائق اور معارف کے دریا بہا دیتے۔ سبک خرام، ندی، دریا کی تیز لہروں کی صورت اختیار کر جاتی۔ میر کی غزلیں، آتش و غالب کی غزلیں، استاد محترم نے جو پڑھا دیں، سو پڑھا دیں۔ یوں ازبر ہو گئیں کہ آج تک نہ ذہن سے محو ہوئیں، نہ دل وہ سماں بھول پایا۔ زندگی میں کئی نابغوں سے سابقہ پڑا مگر پروازی صاحب کے بعد کوئی نظر میں جچا ہی نہیں۔ اقبال کی غزل پڑھائی۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

تو اس کے ساتھ ہی سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کے یہ اشعار بھی پڑھ ڈالے۔

مجھے دیکھ طالبِ منتظر مجھے دیکھ شکلِ مجاز میں
جو خلوصِ دل کی رمق بھی ہے تیرے ادعائے نیاز میں
تیرے دل میں میرا ظہور ہے ترا سر ہی خود سرِ طور ہے
تری آنکھ میں مرا نور ہے مجھے کون کہتا ہے دور ہے
مجھے دیکھتا جو نہیں ہے تو یہ تری نظر کا قصور ہے
مجھے دیکھ طالب منتظر مجھے دیکھ شکلِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تری جبینِ نیاز میں

ان کا اشعار پڑھنے کا انداز ایسا دل نشیں اور دل پذیر تھا کہ تشریح سے پہلے ہی انہوں نے ہمیں تفہیم کی انتہائی سطح پر کھڑا کر دیا۔ آگے جو تشریح ہوئی اس کا جواب نہیں۔ جو پڑھا دیا وہ زندگی بھر بھولا نہیں۔ ان کی زبان سے نکلے ہوئے لفظ اور جملے کے جملے میخ کی طرح دل میں گڑ گئے۔ لیکچر کے لیکچر زبانی یاد ہو گئے۔ اب کہاں ملتے ہیں ایسے استاد۔ اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر۔

پروازی صاحب کی اعلیٰ ترین تدریسی مہارت، طرزِ بیان اور اثر انگیز گفتگو کا سلسلہ دھیان میں آتا ہے تو ''ہوائے دور مئے خوش گوار'' کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان سے براہِ راست فیض پانے والے شاگردوں کی تعداد گننے میں نہیں آتی جو اس وقت دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ شاگرد اپنے دوسرے اساتذہ کو بھی یاد رکھتے ہوں گے مگر پروازی صاحب شائد واحد استاد ہیں جو اپنے کسی بھی شاگرد کے حاشیہ خیال سے کبھی محو نہیں ہوئے۔ میرا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ ان کے طویل عرصہ تدریس کے دوران میں ان کی مقبولیت کا گراف ہمیشہ اونچا رہا۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی سحر انگیز شخصیت ہے جس کے حصار میں کوئی ایک بار آیا تو پھر نکل نہیں سکا، دوسرے ان کی بے پناہ علمی و ادبی بصیرت ہے جو اپنی ایک الگ شان رکھتی ہے۔ زبان و بیان پر عالمانہ دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کی اتھاہ میں اتر کر اس کی باریکیوں تک رسائی کا ہنر ان ہی سے مخصوص ہے۔ ادب پاروں کے فہم و ادراک کے معاملے میں ان کی نکتہ رس طبیعت ایسے ایسے نکات ڈھونڈ لاتی جنہیں تلاش کر لینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

انٹر کے دوران میں انہیں فاصلے پر بیٹھ کر دیکھتا اور سنتا تھا، مگر بی۔اے میں انہیں بہت قریب سے دیکھا۔ اردو اختیاری کی کلاس میں ہم تین طالب علم تھے جو ان کے محدود کمرے میں سما جاتے تھے۔ میرے ساتھ محمد اسلم خالد (لندن) اور ضیاء الرحمٰن امجد مرحوم تھے۔ ضیاء پاکستان ٹیلی ویژن میں پروڈیوسر ہو گئے تھے۔ حالاتِ حاضرہ کے پروگرام کرتے رہے۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور جلد رخصت ہو گئے۔ محمد اسلم خالد بہت متین اور منجھے ہوئے طالب علم تھے۔ ان کا اعزاز یہ ہے کہ وہ کے جی سکول میں ہمارے حضور کے کلاس فیلو رہے ہیں (۱۹۵۸ء) ہم تینوں پروازی صاحب کے قریب سکڑ کر بیٹھ جاتے تھے۔ ان کی باتیں سنتے تھے اور ان کے قرب سے فیض پاتے تھے۔ شادی چائے لے کر آ جاتا ''پروجی دی چاء''، وہ اپنے مخصوص انداز میں کینٹین پر جا کر آرڈر دیتا اور دونوں ہاتھوں سے ٹرے تھامے ہوئے لے آتا۔ ہم چائے پیتے اور گفتگو جاری رہتی۔ نصاب سے بات چلتی اور کہیں دُور جا نکلتی۔ مثنوی سحر البیان پڑھاتے ہوئے واقعات کے تسلسل میں زبان اور بیان زیرِ بحث آتے۔

''دُوں دُوں خوشی کی خبر کیوں نہ دوں''

مثنوی کے اس مصرع میں ''دُوں دُوں'' نوبت کی آواز ہے جس کے بجنے پر خوشی کا اعلان ہوتا ہے۔ استاد محترم بین السطور میں اُتر کر ہمیں وہ نکات سمجھاتے کہ ہم حیرت کے عالم میں منہ کھولے ان کی طرف تکتے رہ جاتے۔ پروازی صاحب کی کلاس میں بیٹھ کر ہمیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔ تعلیم کے ساتھ وہ ہماری تربیت سے بھی بے خبر نہ تھے۔ ہماری حرکات و سکنات پر نظر رکھتے۔ مجھ سے کئی

غلطیاں ہوئیں وہ شفقت سے جتا دیتے۔ اعتماد بھی بلا کا تھا۔ مرزا خلیل احمد مرحوم کے برادرِ نسبتی کی شادی تھی۔ انہوں نے تعاون طلب کیا تو مجھے بھیج دیا۔ میں نے آرائش وزیبائش کے کام میں ان کی مدد کی تو انہوں نے پروازی صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ ادھر پروازی صاحب الٹا میرا شکریہ ادا کرتے رہے۔ عجیب لوگ تھے۔ اخلاق واکرام کی اس بلندی پر تھے کہ دیکھنے کے لئے دستار سنبھالنا پڑتی ہے۔ مرزا خلیل احمد مرحوم حضرت مصلح موعود کے صاحبزادے اور خلیفۃ المسیح الاوّل کے نواسے تھے۔ میرے ذرا سے کام کی اتنی قدر کی کہ راہ چلتے ہوئے مجھے دیکھ کر رک جاتے تھے اور مصافحے کا شرف بخشتے اور گلے لگاتے تھے۔ پروازی صاحب ایک بار مجھ سمیت اپنے چند شاگردوں کو ساتھ لے کر لاہور تشریف لائے اور یہاں اپنے اساتذہ اور نام ور ادیبوں' شاعروں سے ملوایا۔ ان میں میرزا ادیب' احسان دانش' سید وقار عظیم' سجاد باقر رضوی' عبادت بریلوی' مولانا غلام رسول مہر اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر علامہ علاؤالدین صدیقی شامل تھے۔ ان شخصیات سے پروازی صاحب کے گہرے مراسم تھے اور انہوں نے نہایت محبت سے ہماری پذیرائی کی۔ یہ سب لوگ پروازی صاحب سے جس اپنائیت سے ملے اس سے استاد محترم کی قدر ہمارے دل میں کچھ اور بڑھ گئی۔

کالج میں کئی نام ور ادبی شخصیات کو مدعو کر کے اپنے طالب علموں کے لیے ازدیادِ علم کا سامان بہم پہنچاتے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور غلام جیلانی اصغر تو ان کے مستقل مہمان تھے وہ ذرا سے بلاوے پر چلے آتے۔ اور محفل شعر یا کوئی ادبی تقریب بپا ہو جاتی۔ ایک بار پروفیسر حمید احمد خان تشریف لائے۔ مجھے ''بزم اردو'' کے صدر کی حیثیت سے صدارت کا اعزاز حاصل ہوا۔ چوہدری محمد علی صاحب نے ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب ''تخلیقی عمل'' کے حوالے سے مضمون پڑھا اور پروفیسر حمید احمد خان نے گفتگو کی۔

پروازی صاحب کی اصل پہچان ان کی شاعری کے حوالے سے ہے' ادبی دنیا میں وہ اسی حوالے سے معروف ہیں لیکن دل چسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے تحقیق' تنقید اور تراجم کے ذیل میں متعدد کتابیں لکھیں لیکن شاعری کی ایک کتاب بھی منظر عام پر نہیں آنے دی۔ حالانکہ ان کا شعری پایہ بہت بلند ہے۔ تعلیم الاسلام کالج میں اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران میں ان کی لکھی ہوئی ایک نظم برادرم محمد داؤد طاہر کے توسط سے دستیاب ہوئی۔ اٹھارہ اشعار پر مشتمل یہ نظم مثنوی کے پیرائے میں ہے اور منظر کشی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ چند اشعار دیکھیے۔

چٹانوں کا پر ہول و خاموش دامن جہاں وقت بھی سہم کر سو گیا تھا
پہاڑوں کی وہ سحر آلود وادی جہاں کوئی ویرانیاں بو گیا تھا
جہاں گرد کی بیکراں وسعتیں تھیں جہاں رقص کرتے تھے اندھے بگولے
جہاں آرزوؤں کی خاموش قبروں سے اٹھتے تھے آہوں کے زندہ ہیولے
بہاروں کی پریاں جہاں آ کے اندھی فضاؤں کے پنجے میں جکڑی گئی تھیں
خزاؤں کی مسموم سانسیں جہاں زندگی کو جھلس کر تباہ کر گئی تھیں

یہ کس نے فضاؤں کے تاریک دامن میں ڈالا ہے لا کر یہ اُجلا سویرا
یہ کس کے خجستہ قدم لے کے آئے خزاؤں میں روشن بہاروں کا پھیرا
اسی خاک سے لالہ و گل کھلے ہیں جہاں شور تھا اور پانی نہیں تھا
وہاں سرو قد یوکلپٹس اُگے ہیں جہاں گھاس کا نام تک بھی نہیں تھا
اخوت کے پانی سے سیراب بندے محبت کی چنچل نگاہوں کی بستی
یہ علم و عمل کی حسیں شاہراہوں پہ چلتی ہوئی درسگاہوں کی بستی
وہ ٹی آئی کالج کی اجلی عمارت پہاڑی کے دامن میں ستا رہی ہے
حسیں شاخساروں کی اٹھتی جوانی بہاروں کے سائے کو بہلا رہی ہے
وہ ٹی آئی کالج کہ جس نے مجھے روشنی اور رفعت کا تحفہ دیا ہے
اسی کی محبت بھری گود میں آ کے میں نے محبت کا پانی پیا ہے
خدا اس محبت کی بستی کو اپنی محبت سے معمور و پُرنور رکھے
خدا اس کو آفات سے خود بچائے خدا اس کو آفات سے دُور رکھے

طویل بحر کو عموماً سنبھالنا مشکل ہوتا ہے لیکن استاد محترم کی پختہ گوئی اور ہنر مندی ہر شعر سے عیاں ہے۔ عین ممکن ہے کہ آج شاید ان اشعار کو پروازی صاحب کے بہترین نامۂ سخن میں شمار نہ کیا جائے۔ لیکن یہ اس وقت کی یادگار ہے جب وہ ٹی آئی کالج ربوہ سے غالباً بی۔اے آنرز کر رہے تھے۔ پروازی صاحب مشاعروں میں اپنا کلام پیش کرتے رہے ہیں۔ اور یوں اہل ذوق کی تسکین بھی ہوتی رہی اور نئے شاعروں کو سلیقے سے شعر کہنے کی رہنمائی بھی ملتی رہی۔ ان کا ایک نعتیہ شعر، سادہ بیانی اور اثر انگیزی کی ایک بلیغ مثال۔

نام خیر الانام کا لکھا
ایک ہی لفظ کام کا لکھا

ان کی غزلوں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بند تھے سارے دریچے کہاں دستک دیتے
شہر میں کون سخی تھا جو گدائی دیتا

بیلیں جھکی ہوئی ہیں دریچے اداس ہیں
چہرہ وہ پھول جیسا یہاں پر جو تھا نہیں

ہولے ہولے چڑھ آیا ہے جمنا کا طوفان
رفتہ رفتہ ڈوب گئے ہیں تاج محل کے سائے

خواہش بہت تھی ہم بنیں ان کی گلی کی خاک
ہم خاک ہو گئے تو ہوا تیز ہو گئی

ہم تو رہتے ہیں محبت کے ادب میں پیچھے
لوگ ہوتے ہیں کسی اور سبب سے آگے

تحقیق کے شعبے میں پروازی صاحب کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور کی غیر مطبوعہ فہرست مقالات کے مطابق یہ مقالہ ''اردو ناول نذیر احمد سے مرزا رسوا تک'' کے موضوع پر ۱۹۶۶ء میں لکھا گیا۔پروفیسر سید وقار عظیم اس کے نگران تھے اور اس پر پروازی صاحب کا اصل نام ناصر احمد خاں درج ہے۔یہ مقالہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔

پروازی صاحب کے سینکڑوں علمی' ادبی اور تنقیدی مضامین ملک کے وقیع جرائد ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ان کا اہم ترین ادبی کارنامہ اردو کی اہم خودنوشتوں کا تنقیدی جائزہ ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ اس کام کی تحریک انہیں اس وقت ہوئی جب وہ الپسالا یونیورسٹی سویڈن میں بعض ریسرچرز کو برصغیر کے مدبرین کی سیاسی سوانح عمریوں پر کام کروا رہے تھے۔چنانچہ انہوں نے اردو کے مراکز سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر آپ بیتی کے حوالے سے جو شان دار کام کیا ہے اس کی نظیر پیش کرنا مشکل ہے۔اس سلسلے کی پہلی کتاب ''پس نوشت'' ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں ۷۵ آپ بیتیوں کے گہرے اور تفصیلی مطالعے کے بعد ان پر اپنی ناقدانہ رائے پیش کی گئی ہے۔دوسری کتاب ۲۰۰۸ء میں ''پس نوشت اور پسِ پس نوشت'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔اس کتاب کو گذشتہ کتاب کی توسیع سمجھنا چاہیے جس میں ''پس نوشت'' کی تقریباً ۷۱ آپ بیتیوں سمیت ۱۴۲ آپ بیتیاں شامل ہیں۔گویا مزید ۷۱ آپ بیتیاں شامل کر کے اپنے مطالعے کا دائرہ وسیع کر دیا گیا ہے۔اس کتاب میں معروف دانش ور اور مصنف ڈاکٹر داؤد رہبر کے دو طویل خطوط بھی شامل کیے گئے جن میں پروازی صاحب کے اس کام کو سراہا گیا ہے۔البتہ تنقید کے لہجے کو نرم کرنے کا مشورہ بھی دیا گیا ہے۔''پس نوشت'' حصہ سوم ۲۰۱۰ء میں

شائع ہوئی جس میں ۶۹ آپ بیتیوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ یوں پروازی صاحب کے دائرہ تنقید میں آنے والی آپ بیتیوں کی تعداد ۲۱۱ ہو جاتی ہے۔ یہ تعداد ”نقوش“ کے آپ بیتی نمبر اور دیگر محققین اور ناقدین کی طرف سے پیش کی گئی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ اس پر مستزاد آپ بیتیوں کی وہ تعداد بھی ہے جو اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں لکھی گئی ہیں اور انہیں بھی موضوع تنقید بنایا گیا ہے۔ پروازی صاحب اپنے گہرے مطالعے اور انتہائی توجہ اور محنت سے اس کام کو اس سطح پر لے آئے ہیں کہ آپ بیتی پر کام کرنے والا کوئی محقق اس سے اکتساب کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پروازی صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک ایک آپ بیتی کو لے کر اس کے مندرجات اور بین السطور تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور اس میں بیان کیے گئے واقعات کی صداقت کو پرکھنے کے لئے دیگر آپ بیتیوں کے حوالے بھی اپنے ذہن میں مستحضر رکھتے ہیں اور جہاں کسی نے غلط بیانی کی وہاں فوراً اس کی گرفت کرتے اور اسے واقعہ کی اصلیت اس کے درست تناظر میں یاد دلاتے ہیں۔ ان کی یادداشت میں تمام آپ بیتیاں محفوظ ہیں اور وہ ان کے جھوٹ سچ سے پوری طرح واقف ہیں۔ اس جھوٹ سچ کو بے نقاب کرنے میں وہ کسی مصلحت کو رکاوٹ نہیں بننے دیتے۔ یہاں معروف ترقی پسند دانش ور حمید اختر کی یہ سطور درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں۔

”کسی بھی زیر تبصرہ کتاب میں کوئی تضاد بیانی ہو یا کسی لکھنے والے نے واقعات بیان کرنے میں غلطی کا ارتکاب کیا ہو تو برسوں بلکہ عشروں قبل شائع ہونے والی کسی دوسری آپ بیتی کے مستند حوالوں سے معہ اس کتاب کے صفحہ نمبر کے متعلقہ تحریر کے ذریعے صحیح واقعات سامنے لے آتے ہیں۔ دوڈھائی سو کتابوں کے جن کی اشاعت کا زمانہ ستر اسی برس پر محیط ہو' متن سے ایسے حوالوں کو ڈھونڈ نکالنا یا یاد رکھنا ہمارے جیسے خاکی انسان کے بس کی تو بات ہی نہیں۔ ایسا جناتی کام پروازی صاحب جیسا آدمی ہی کر سکتا ہے جسے اپنے علمی اور تحقیقاتی کام سے جنون کی حد تک لگاؤ ہو۔“

(پس نوشت جلد سوم ص ۱۰)

پروازی صاحب ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۹ء تک جاپان کی اوساکا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز میں وزٹنگ پروفیسر رہے ہیں۔ اس دورانیے میں انہوں نے اپنے کارِ منصبی سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ جاپانی زبان اور وہاں کے کلچر اور ادب کا بھی بنظرِ غائر مطالعہ کیا۔ اس مطالعے کا حاصل ان کی چھ کتابیں ہیں۔ جن میں ایک ناول ”آکی مے“۔(۱۹۹۴ء) ایک سفر نامہ ”سورج کے ساتھ ساتھ“ (۱۹۸۰) ہائیکو پر تنقیدی مضامین (۱۹۹۷) اور تین تراجم ” خوب صورت جاپان اور میں“(۱۹۹۷ء)۔”جاپان کا سب سے لمبا دن“ (۱۹۷۸ء) اور ”ہائیکو“ (۱۹۷۹) کے نام سے جاپانی شاعری کا ترجمہ شامل ہیں۔ ہمارے یہاں کے کئی اسکالر اور پروفیسر اس منصب پر جاپان رہ چکے ہیں لیکن جاپان اور اس کی ثقافت کو اُردو ادب میں متعارف کرانے کے حوالے سے ان کا خانہ خالی ہی رہا۔ یہ کام صرف پروازی صاحب ہی کر سکتے تھے جو اپنے ہدف پر نظر رکھتے اور اسے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ پروازی صاحب نے سر ظفر اللہ خان کے حوالے سے بھی دو کتابیں تالیف کیں جن میں ”سر ظفر اللہ خان کا تحریکِ آزادی میں حصہ“ (۲۰۰۲ء) اور ”سر ظفر اللہ خان کی یادداشتیں“ (۲۰۰۳ء) شامل ہیں۔

۲۰/اکتوبر ۱۹۳۶ء کو بھارت کے شہر قادیان میں جنم لینے والے پروازی صاحب ۲۰/اکتوبر ۲۰۲۳ء کو ۸۷ برس کے ہو جائیں

گے۔ان کے علمی وادبی ذوق وشوق کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے ابھی تک قلم ہاتھ سے نہیں رکھا۔اگرچہ کئی عوارض دامن گیر ہیں لیکن دل کی تاب وتواں قائم ہے۔زندگی میں بے شمار مسائل کا سامنا رہا۔علم وادب کا یہ گوہر نایاب ناقدری حالات کا شکار رہا لیکن اس نے کسی مرحلے پر خود کو نگوں سار نہیں ہونے دیا۔میں ان کی تندرستی اور صحت یابی کے لیے دعا گو ہوں۔انہوں نے ”حبل الورید“ کے نام سے قرآن پاک کا بامحاورہ اردو ترجمہ بھی کر رکھا ہے۔اللہ کرے پروازی صاحب کا یہ اہم کام بھی جلد منظر عام پر آئے۔

ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی

سابق پروفیسر تعلیم الاسلام کالج ربوہ

ایک احمدی سائنس دان کا اعزاز

احباب جماعت میں یہ خبر خوشی سے سنی جائے گی کہ ہمارے احمدی سائنسدان پروفیسر ڈاکٹر محمد شریف خاں صاحب مقیم امریکہ کو پاکستان زوالا جیکل سوسائٹی کی جانب سے ان کی اہم سائنسی تحقیقات کے اعتراف میں سال ۲۰۱۴ کے لئے لائف اچیومنٹ ایوارڈ عطا کیا گیا ہے۔ (ان کی تحقیقات کی تفصیل کا ہلکا سا خاکہ الفضل مؤرخہ ۲ اپریل اور ۱۳ اپریل ۲۰۱۴ میں دو اشاعتوں میں شائع ہو چکا ہے) زوالا جیکل سوسائٹی آف پاکستان کے صدر ممتاز قومی پروفیسر ڈاکٹر اے آر شکوری تمغہ امتیاز نے اس اعزاز کے متعلق ڈاکٹر محمد شریف خاں صاحب کو مطلع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مجھے اس بات کا اظہار کرتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے زوالا جیکل سوسائٹی آف پاکستان کی انتظامیہ کمیٹی نے ۲۰۱۴ کے لئے آپ کو لائف اچیومنٹ ایوارڈ

عطا کرنے کی منظوری دی ہے۔ یہ ایوارڈ آپ کو بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں ۲۵ فروری ۲۰۱۴ کو پاکستان کانگریس آف زوالوجی کے زیر اہتمام ہونے والی بین الاقوامی زوالاجیکل کانفرنس کے موقع پر عطا کیا جائے گا۔'' ڈاکٹر صاحب موصوف خود تو اس موقعہ پر تشریف نہیں لے جاسکے ان کے ایک احمدی شاگرد وسیم احمد خاں نے یہ اعزاز وصول کیا۔ اللہ تعالیٰ اس اعزاز کو ڈاکٹر صاحب موصوف کے لئے اور جماعت کے لئے مبارک کرے۔ آمین۔

ایوارڈ عطا کرنے کے موقعہ پر کہا گیا کہ 'ڈاکٹر (محمد شریف) خان نے پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۶۳ میں ایم ایس سی کی اور یونیورسٹی میں اول آنے پر ولیم رابرٹس گولڈ میڈل حاصل کیا۔ آپ نے ۱۹۶۳ میں ہی تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے لیکچرر کی حیثیت سے اپنا کام شروع کیا اور ۱۹۹۹ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ڈاکٹر خان نے پاکستان کے HERPS پر اپنا تحقیقاتی کام ایسے وقت میں شروع کیا جب ان کے سامنے کوئی مثال موجود نہیں تھی اور ثابت قدمی کے ساتھ اس میدان میں تحقیقات جاری رکھیں۔ اب تک ڈاکٹر صاحب ۳۴ نئی اقسام دریافت کر چکے ہیں جن میں ۱۴ سانپ ۱۵ چھپکلیاں اور ۸ مینڈک شامل ہیں۔ انہیں بین الاقوامی سطح پر اس میدان کا ماہر تسلیم کیا جاتا ہے۔ مختلف زبانوں میں ان کی متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کئی بین الاقوامی اداروں کے منصوبوں پر کام کیا ہے ان میں ورلڈ وائلڈ لائف پاکستان اور پاکستان سائنس فاؤنڈیشن کے منصوبے قابل ذکر ہیں۔ آپ نے بہت سے ایم ایس سی کے مقالوں کی نگرانی کی اور اب بھی اپنے میدان میں ریسرچرز کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ آپ نے اپنا تمام جمع شدہ نایاب قیمتی سرمایہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کو عطا کر دیا ہے اور وہاں ریسرچرز کے کام آرہا ہے۔ اس خاص میدان میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ۲۰۰۲ میں سال کا بہترین ماہر حیوانیات قرار دیا گیا تھا۔"۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو بیش از پیش خدمات کی توفیق عطا فرمائے اور وہ اس میدان میں احمدیت کا نام اور زیادہ روشن کرنے والے ہوں۔
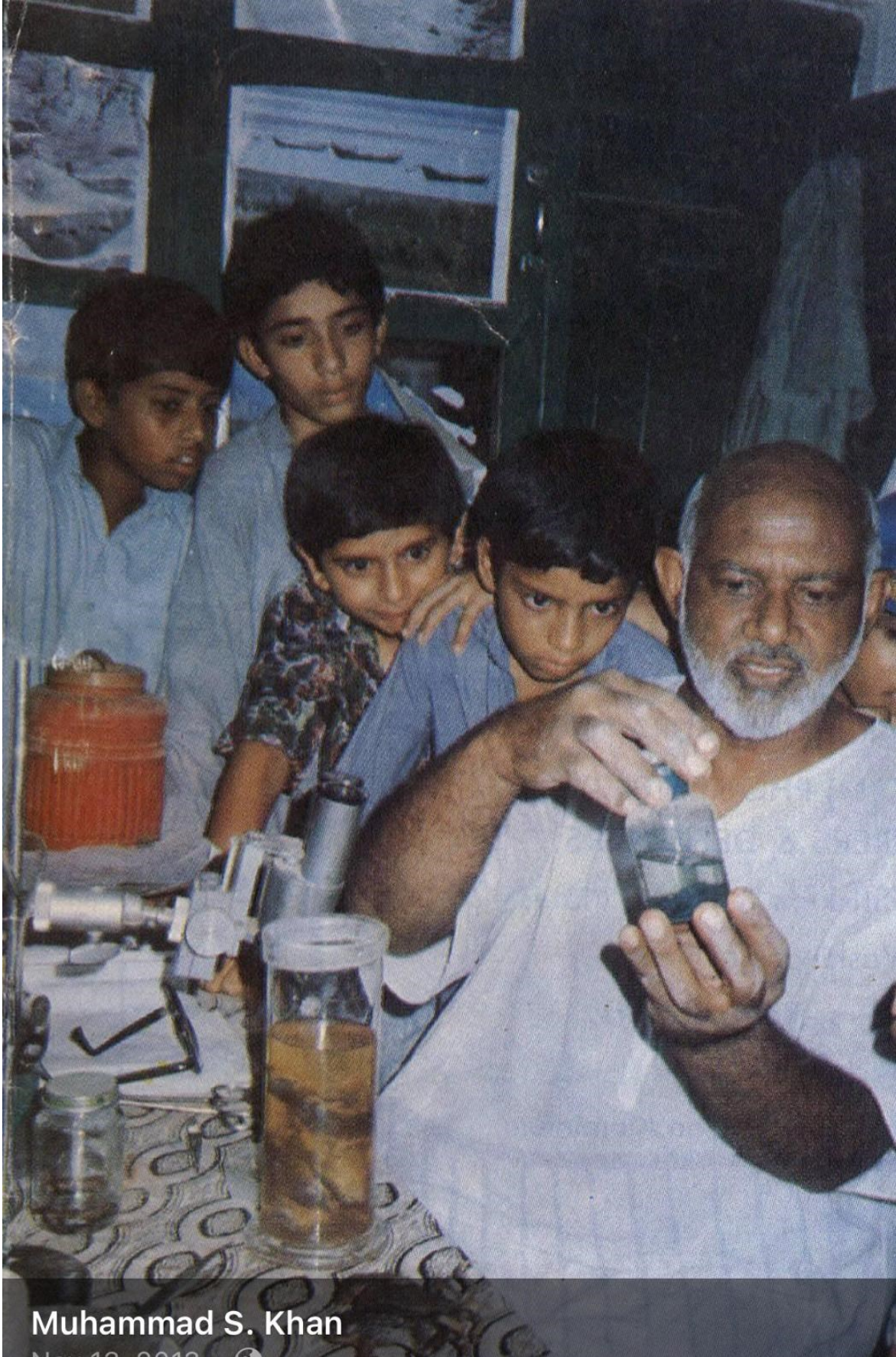
Muhammad S. Khan

ناصر احمد وینس

استاذی المکرم جناب پروازی صاحب کی بذلہ سنجی وخوش مزاجی

استاذی المکرم پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد خان پرویز پروازی صاحب اور استاذی المکرم پروفیسر ڈاکٹر محمد شریف خان صاحب تعلیم وادب کے دو ایسے ستارے تھے جن کے ٹوٹ جانے سے آسمان کا ایک حصہ خالی ہو گیا۔ جن کے ہونے سے دنیائے ادب، علم وسائنس کی توقیر وحسن میں ایک ایسی دلکشی تھی جو انہی سے مخصوص تھی۔

زیر نظر سطور میں، اپنے مولائے حقیقی کے حضور حاضر ہونے والے استاد محترم جناب پرویز پروازی صاحب کی یادوں پر مشتمل چند بھولی بسری یادیں، ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں پیش کرنے کی جسارت کرنے لگا ہوں۔ اور شائد وجود کی یہی وہ پراسرار صدا ہے جس کی یاد اور بازگشت میں روحوں کا سفر جاری رہتا ہے

سورج گھر سے نکل چکا تھا کرنیں تیز کیے
شبنم، گل سے پوچھ رہی تھی مہلت کتنی ہے؟

بلاشبہ پروازی صاحب جیسے صاحبان کمال راتوں رات پیدا نہیں ہوتے۔ پروازی صاحب جتنے بڑے ادیب، شاعر، انشاء پرداز، پروفیسر اور تاریخ دان تھے، اتنے ہی عمدہ انسان بھی تھے۔ ان کے جملوں کی مخصوص کاٹ، شوخی، بذلہ سنجی ان کی باغ وبہار اور زندہ دل شخصیت کا آئینہ دار تھی۔

کیونکہ مسکراہٹ اظہار کا وہ اسلوب ہے جس کے راستے کبھی بند نہیں ہوتے۔ مزاح اور لطائف انہی راستوں کے وہ راہی ہیں جن کی ہمسفری میں زندگی ہنستی ہے، مسکراتی ہے اور مرجھائے ہوئے دل بھی کنول کی طرح کھل اٹھتے ہیں۔ استاذی المحترم پروازی صاحب کی اس خداداد صلاحیت کے چند واقعات بیان کرنا چاہتا ہوں۔

اپنے وقت کی بے مثال درسگاہ تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے فارغ التحصیل طلباء محترم پروازی صاحب کی بذلہ سنج شخصیت سے خوب واقف ہونگے۔ بالخصوص جنھوں نے ان کا "سفر نامہ جاپان" پڑھاہے وہ یقیناجانتے ہونگے کہ وہ معمولی موضوعات کو بھی کتنی چابکدستی سے وسعت دے کر ان کے اندر معانی کی ایک خوش باش دنیا سجادیتے تھے -اور کوئی خواہ کتناہی ذود رنج واقع کیوں نہ ہوا ہو یہ سطور پڑھتے ہی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر خود بخود کھیلنے لگ جاتی ہے۔

ایک دفعہ کالج میں پروازی صاحب اور عربی کے ایک سینئر پروفیسر صاحب کے درمیان عربی کے کسی لفظ پر بحث چل نکلی۔ دونوں میں سے کوئی بھی ہتھیار ڈالنے پر تیار نہ تھا۔ آخر عربی کے پروفیسر صاحب زچ ہو کر کہنے لگے:

"پروازی! تم بھلا عربی ادب کو کیا جانو۔ عربی زبان کا ماہر تو میں ہوں!"

پروازی صاحب (جنکے بڑے بیٹے کانام ماہر احمد ہے) نے ان عربی کے استاد محترم کی بات پر برجستہ جواب دیا:

اور میں ماہر کا باپ ہوں !

جس پر مدمقابل پروفیسر صاحب ناراض ہوگئے۔ اور سیدھے پرنسپل صاحب کو جاکر شکایت لگادی۔ پرنسپل صاحب نے پروازی صاحب کو بلایا اور شکایت کا تذکرہ کیا۔ پروازی صاحب کہنے لگے کہ ماہر احمد تو میرے بڑے بیٹے کانام ہے! جس پر پرنسپل صاحب بھی ہنس پڑے اور یوں معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

ایک دوسرا واقعہ خود خاکسار کے متعلق ہے۔ فرسٹ ائیر کے پہلے روز کا اردو پیریڈ تھا۔ کالج ہال طلباء سے بھرا ہوا تھا۔ پروازی صاحب نے پہلے روز ہر طالب علم سے اس کا نام پوچھا۔ نیز یہ کہ وہ کہاں (مراد ربوہ کے کس محلہ یا بیرون ربوہ کس شہر) سے ہے؟ ہر کوئی اپنے محلہ یا شہر وغیرہ کا نام بھی بتا رہا تھا۔

خاکسار کی باری آئی تو عرض کیا: سر! گھر سے آیا ہوں !

تمام طلباء میری طرف دلچسپی سے دیکھنے لگے -پروازی صاحب نے ایک بھرپور نظر مجھ پر ڈالی اور فرمایا: گھر سے عموماوہ آتا ہے جو گھر بار والا ہو۔ یعنی بال بچے دار ہو۔ اچھا، اب لگے ہاتھوں یہ بھی بتادو کہ تمہارے کتنے بچے ہیں؟ بس پروازی صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ الغرض پروزی صاحب کی کس کس بات کا تذکرہ کیا جائے۔

لاءکالج لاہور میں منعقدہ ایک مباحثہ کا احوال آپ کے ایک مضمون "ذہن کے دریچوں سے خود نمائی" مطبوعہ روزنامہ الفضل ربوہ میں بایں الفاظ شائع ہوا کہ ارشاد حسین کاظمی کا ایک شعر ہے

ہیں دشت میں غم جان کے لالے پڑے ہوئے

چہرے وفا کی دھوپ سے کالے پڑے ہوئے

ارشاد حسین کاظمی نہایت ذہین آدمی تھے۔اس لیے اپنے ہمعصر مقررین میں سے اکثر بزعم خویش بڑے مقررین ان سے جلتے تھے۔لاء کالج کے ایک مباحثہ میں کاظمی صاحب کو خدا جانے کیا سوجھی کہ انگریزی میں تقریر کرنے کھڑے ہوگئے۔آواز پاٹ دار تھی۔اس پر استدلال کے بادشاہ، سامعین پر چھاگئے۔ میرے پاس ہی احمد رضا قصوری بیٹھے ہوئے تھے۔(جنکے والد کے قتل میں بھٹو کو پھانسی کی سزا ہوئی تھی) وہ بہت چین بہ چیں ہو رہے تھے۔پہلو پہ پہلو بدل رہے تھے۔مگر انہیں اعتراض کا موقع نہیں مل رہا تھا۔میں نے قصوری صاحب سے کہا "سنا نہیں آپ نے، یہ کاظمی کتنے غلط سپیلنگ بول رہا ہے! قصوری صاحب بھولے آدمی، بھرے میں آگئے اور فوراً پوائنٹ آف آرڈر پر کھڑے ہوگئے۔اور کہا:

"جناب والا! فاضل مقرر سے کہا جائے کہ وہ غلط سپیلنگ بولنے سے احتراز کرے!"

اب فاضل مقرر سپیلنگ ٹھیک بولتے تھے یا غلط، قصوری صاحب کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ سارا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔تب قصوری صاحب کو احساس ہوا کہ اورینٹل کالج کا ایک مقرر (پروازی) ان کیساتھ کیا ہاتھ کر گیا ہے!

اسکے بعد تجربہ سے بھی یہی ثابت ہوتا رہا کہ قصوری صاحب کو ہمیشہ وقت کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ان کیساتھ کیا ہو گیا ہے!؟ پہلے ہلے میں تو جو جی میں آئے کہہ یا کر گزرتے ہیں!

"ذہن کے دریچوں سے خود نمائی" نامی قسط وار مضامین میں ہی پروازی صاحب ایک اور دلچسپ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ٹی ائی کالج ربوہ کے ایک مشاعرہ میں محترم جناب راجہ غالب احمد صاحب بھی تشریف لائے۔اس وقت جوان اور بے ریش تھے۔میری خواہر نسبتی غور سے مشاعرہ سنتی رہی۔جب "غالب صاحب" کی باری آئی تو چونکا ہو بیٹھی۔کیونکہ یہ نام اس کے کورس کی کتابوں میں بار بار آتا تھا اور اس نے غالب کی تصویر بھی دیکھ رکھی تھی۔

مشاعرہ ہو چکا تو تو کہنے لگی:

"بھائی جان! یہ غالب نے اپنی داڑھی کیوں صاف کروادی ہے؟"

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ اب تو وہ امریکہ میں ہے۔اگر یہاں ہوتی تو کہتا کہ لو! غالب کو دیکھ لو۔اس نے پھر سے داڑھی چھوڑ دی ہے!

جماعت احمدیہ کے چوتھے امام سیدنا حضرت مرزا طاہر احمد صاحب (رحمہ اللہ) کے بارے میں پروازی صاحب لکھتے ہیں کہ 1991ء میں انکی خدمت میں لندن حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ انہی دنوں ان کے متعلق انگریز مصنف مسٹر ائین آدم سن کی کتاب شائع ہو کر آئی۔ ازراہ شفقت ایک نسخہ اٹھا کر دستخط فرمائے اور ہمیں دے دیا۔ ہم نے ایک ہفتہ لندن قیام کے دوران مذکورہ کتاب کا اردو ترجمہ کر لیا۔ سویڈن جانے کیلئے روانہ ہونے لگے تو ترجمہ کا مسودہ ہمارے ہاتھ میں تھا۔ فرمانے لگے کہ

"یہ کیا ہے؟" عرض کی:

حضور! اس "بندے دے پتر" کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

حیرت سے فرمایا: "بندے دا پتر کون !؟"

میں نے عرض کیا:

" حضور! میں نے "آدم سن" کا ترجمہ بھی کر دیا ہے!"

بہت خندہ فرمایا۔ بعد میں دوستوں کو خود بھی یہ لطیفہ سنایا۔

ایک دفعہ پروازی صاحب نے دوران لیکچر، ربوہ کے مشہور و معروف نصرت کیمیکل" والوں کے تیار کردہ چورن ہاضمون کی افادیت کے متعلق راولپنڈی کے مزاح گو شاعر ناجی سبزواری کا یہ دلچسپ قطعہ سنا کر سب طلباء کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہاضمون نامی چورن کیساتھ اس کی افادیت کے متعلق دواخانے والوں کی طرف سے شائع کردہ شاعری کا بیان بھی ہو جائے، جو ہر پڑیا کے ساتھ لکھی ہوتی تھی کہ:

ہاضمون کیا خوب دوائی　　　ربوے وچ حکیم بنائی

بندہ ہائے ہائے کردا ہووئے　　　ڈھڈ پیڑ نال مردا ہووئے

چٹکی پانی نال کھوائی

ہاضمون کیا عجب دوائی

کھانسی پیچش تک آزمائی　　　بچے کھاون وانگ مٹھائی

نصرت کیمیکل بنائی

ہاضمون کیا خوب دوائی

اس قدر تاثیر والے ہاضمون کی بابت، اب ناجی سبزواری کا یہ قطعہ محترم پروازی صاحب کی زبانی سن لیجئے گا:

اس قدر تاثیر دیکھی نہ سنی
گل گئے جبڑے میرے دانتوں سمیت
اور جب معدہ میں اتری ہاضمون
ہضم کھانا ہو گیا آنتوں سمیت

یہ چند سطور محترم پروازی صاحب کی یاد میں لکھ تو دی ہیں۔ مگر دلی جذبات کی کیفیات وہی ہیں جن کا اظہار، محسن بھوپالی نے اپنے ایک شعر میں کچھ یوں کر رکھا ہے:

آج ٹوٹ کر اس کی یاد آئی تو احساس ہوا محسن
اتر جاتے ہیں جو دل میں وہ بھلائے نہیں جاتے

Akshay

عباس تابش، مقصود وفا
نقوی، شوکت فہمی
رک، موناشہاب
13اگست 2016
شعری
نشست
بالٹی مور، میری لینڈ
Alumni Associat
ئے قدیم تعلیم الاسلام کالج
یو۔ایس۔اے

زکریا ورک۔ٹورانٹو

پروفیسر پرویز پروازی کی باتیں اور انمٹ یادیں

ربوہ میں میرے بچپن میں ایک ادبی مجلس بزم خیال ہوا کرتی تھی۔ایک دفعہ میرے بڑے بھائی محمد ادریس اس ادبی تنظیم کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے مجھے بھی ساتھ لے گئے۔وہ اس مجلس کے سیکریٹری تھے۔یہ اجلاس شاید عبد السلام اختر کے صدر انجمن کے کوارٹرز میں منعقد ہوا تھا۔اس مجلس کا ذکر ''بیتے لمحوں کی چاپ'' میں صفحہ 121 پر کیا گیا ہے۔اس وقت میری عمر بارہ سال کے لگ بھگ تھی۔وہاں میں نے پہلی بار بزرگوارم پروازی صاحب کو دیکھا تھا۔

پھر تعلیم الاسلام کالج میں تعلیم 1963-65 کے دوران گرامی القدر پروازی صاحب ہمارے اردو کے استاد تھے۔میری آنکھوں کے سامنے وہ کالج کا بڑا ہال روز روشن کی طرح اب بھی ہے جہاں 200 کے قریب طلباء کو آپ اردو ادب سے لگاؤ اور شناسائی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔اشعار کی اس رنگ میں تشریح فرماتے کہ انسان سنتا ہی رہے۔مجھے یاد ہے بعض دفعہ آپ طالب علموں کو کسی کتاب سے پیراگراف پڑھنے کو دیتے تا معلوم ہو سکے کہ طالب علم کا تلفظ کیسا ہے۔

اس کے بعد میں کراچی چلا گیا۔وہاں سے جرمنی اور پھر 1973 میں کینیڈا ہجرت کر کے آ گیا۔پروازی صاحب جاپان چلے گئے، وہاں سے پاکستان واپس آنے کے بعد شدید مذہبی جنونی ماحول اور تعصب کے بناء پر سویڈن ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔سویڈن میں جب آپ رہائش پذیر تھے تو میرا ان سے رابطہ ہوا۔خطوط کا سلسلہ جاری رہا۔اپنے ایک خط مؤرخہ 22 جنوری 1992 میں انہوں نے مجھے لکھا "زکریا تم مجھے اکثر یاد آئے ہو مگر کوئی صورت رابطہ کی نہ ہوئی۔پھر وہ ادریس خدا معلوم کہاں ہے۔ہم لوگوں نے ربوہ میں بڑا اچھا وقت اکٹھے

گزارا ہے۔اس لئے وہ یادیں ذہن میں مستحضر ہیں"۔

1994 ٹورانٹو میں آمد

1994 میں آپ ٹورانٹو اپنے بیٹے ماہر احمد سے ملنے کے لیے آئے۔ مجھ سے رابطہ ہوا۔ میں کنگسٹن سے تین سو کیلو میٹر کا سفر کر کے آپ کے پاس پہنچا۔ سب سے پہلے ہم نے ٹورانٹو ریفرنس لائبریری کو وزٹ کیا۔ یہاں اردو کی کتابیں کثیر تعداد میں ہیں۔ اس کے بعد ہم نے کھانا کھایا۔ میرے اصرار پر کینیڈا کی راجدھانی آٹوا کی سیر کرنا پسند فرمائی۔ کنگسٹن میں رات قیام کے بعد میں آپ کو آٹوا لے کر گیا۔ پارلیمنٹ پہنچے وہاں ان دنوں ایک پارلیمنٹری اسسٹنٹ جن کا نام Bob Lay تھا ان کی نسیم مہدی سے واقفیت تھی۔میں نے باب کو فون کیا اس نے ہمارا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ اس نے ہمیں ہاؤس آف کامنز اور سینیٹ کی سیر وی آئی پی مہمان کے طور پر کروائی۔ نیز ان کی شاندار لائبریری کی ایک گھنٹے تک سیر کروائی جہاں ہمارے لیے جانا شاید ممکن نہ ہوتا۔

کچھ روز بعد میں نے آپ کو شہرہ آفاق ٹورسٹ سپاٹ Thousand Island کی بحری بوٹ پر تین گھنٹے کی سیر کروائی۔ جس سے آپ بہت لطف اندوز ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد ہم آپ کو ٹورانٹو واپس چھوڑنے آئے۔ یہ سفر نامہ احمدیہ گزٹ کینیڈا میں اکتوبر 1994 میں شائع ہوا تھا جس میں ہدایت اللہ ہادی، ادریس شاہین اور خالد تاج کی مہمانی نوازی کا خاص ذکر کیا گیا تھا۔ واپس سویڈن جا کر آپ نے مجھے نامہ مرقومہ 1994/ 8/ 4 میں لکھا "پیارے زکریا۔ السلام علیکم میرے قیام کینیڈا کے دوران تم نے اور تمہاری بیوی نے جو خدمت کی اس کے لئے تہہِ دل سے ممنون ہوں۔ اللہ تمہیں خوش رکھے اور دین اور دنیا میں بے شمار کامرانیاں عطا کرے۔ تمہاری اولاد کو تمہارے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے۔ یہ خط رسمی خط نہیں ہے دل سے نکلی ہوئی دعائیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے"۔

2010۔ قلمکار حمید اختر سے ملاقات

مئی 2010 میں آپ نے مجھے فون کیا کہ پاکستان کے مشہور مصنف، کالم نویس صحافی حمید اختر ٹورنٹو آرہے ہیں اس لئے فلاں دن ٹورنٹو آجاؤ۔ ہم ان سے ملنے جائیں گے۔ چنانچہ عاجز حسب خواہش آپ کے گھر پہنچ گیا۔ حمید اختر (1924-2011) اپنی بیٹی کے یہاں فروکش تھے جس کا گھر نارتھ یارک میں تھا۔ ان کی بیٹی نے ہماری خوب آؤ بھگت کی۔ علمی ماحول میں باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے حمید صاحب کو اپنی کتاب سوانح البیرونی پیش کی۔لاہور واپس جا کر انہوں نے اس پر سیر حاصل تبصرہ لکھا جو روزنامہ ایکسپریس میں شائع ہوا تھا۔ کھانے کے بعد ہم تینوں پیس ولیج

گئے تا ان کو اس احمدی رہائشی علاقے کی سیر کروائی جائے۔ شام کو ہم نے معزز مہمان کو ان کے گھر پہنچا دیا۔ اور پروازی صاحب کو ان کی قیام گاہ پر۔ حمید اختر کو کچھ سال ترقی پسند خیالات و نظریات اور تحریروں کی وجہ سے جیل میں پابند سلاسل بھی رہنا پڑا۔ ایام اسیری کی یادوں پر مشتمل اوسان خطا کرنے والی داستاں انہوں نے کال کوٹھری کے نام سے تحریر کی جو کہ ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔

پروفیسر ابو الکلام قاسمی سے ملاقات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ابو الکلام قاسمی (معروف ادبی نقاد، متعدد کتابوں کے مصنف اور پندرہ سال تک ایڈیٹر ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ رہے) 2014 میں ٹورانٹو تشریف لائے کیونکہ ان کا بیٹا سمیر قاسمی مسی ساگا میں رہتا تھا۔ کچھ روز بعد وہ میری رہائش گاہ پر بیگم اور بیٹے کے ہمراہ کھانے پر تشریف لائے۔ اگلے روز میں نے پروازی صاحب کو فون پر بتایا کہ قاسمی صاحب ٹورانٹو میں ہیں۔ فرمایا میں ان کا انٹرویو اپنے راول ٹی وی کے پروگرام "چہرے" کے لئے کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے پروازی صاحب کو ان کی قیام گاہ سے لیا۔ وہاں سے ہم قاسمی صاحب کے گھر گئے اور وہاں سے ٹیلی ویژن سٹیشن۔ میں نے سٹیشن تک جانے کے لیے راستہ ایک کاغذ پر لکھا ہوا تھا جس کو قاسمی صاحب دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے وہ میری ڈرائیونگ سے متاثر ہوئے۔ اس پروگرام میں ہم تینوں شریک ہوئے۔ اس پروگرام کو بہت

سراہا گیا۔اس کے بعد ہم قاسمی صاحب کو ایک اچھے ریستوران میں کھانے پر لے کر گئے۔ کھانا ختم ہونے سے قبل آپ نے میز کے نیچے چپکے سے میرے ہاتھ میں پچاس ڈالر کا نوٹ تھما دیا حالانکہ اس عزت افزائی کا حقدار میں بننا چاہتا تھا۔

کچھ سالوں بعد قاسمی صاحب پھر ٹورانٹو اپنے بیٹے کے پاس آئے۔ پروازی صاحب نے کہا کہ اس بار میں ان کی بیگم کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں جو کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ پروازی صاحب اور میں ان کے گھر پہنچے اور ہماری حسب معمول خاطر تواضع کی گئی۔ اس کے بعد ٹیلی ویژن سٹیشن پہنچے۔ پروازی صاحب نے نہ جانے کس طرح ان کی بیگم دردانہ قاسمی کے ادبی کام کے بارے میں کافی معلومات اکھٹی کی ہوئی تھیں۔ اور ان کے مضامین اور ادبی کام سے بخوبی واقف تھے۔ سٹوڈیو میں صرف تین افراد کی جگہ تھی اس لیے میں انٹرویو میں شامل نہ ہو سکا۔ اس ملاقات کے دوران یہ تین پروفیسر علم و آگہی کے جو موتی بکھیرتے رہے اور شعر و نغمہ پر گفتگو کرتے رہے اس کو راقم الفاظ کا جامہ پہنانے سے قاصر ہے۔ افسوس پروفیسر ابوالکلام قاسمی بعارضہ سرطان لمبی علالت کے بعد جولائی 2021 میں وفات پا گئے۔

ٹورانٹو کے راول ٹی وی پر "چہرے" کے نام سے آپ نے جن مشاہیر، ادیبوں، مصنفین اور شعراء کے انٹرویو کیے ان کی تعداد میرے حساب سے کم از کم پچاس کے قریب ہے۔ آپ نے کمال شفقت اور سخاوت سے میرا انٹرویو بھی کیا جس میں میری شائع شدہ کتابوں اور مضامین پر سیر حاصل بحث کی گئی۔ ایک طالب علم کیلئے اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے۔ یہ میرے لئے کسی اعزاز یا ایوارڈ سے کم نہیں کہ ان کے پایہ کے محقق اور مایہ ناز ادیب نے مجھ ہیچمداں کا انٹرویو کیا۔

آپ کو جب میں آپ کی قیام گاہ سے ٹیلی ویژن سٹیشن لے کر جاتا تو مجھے ڈائریکشن دیتے جاتے حالانکہ میرے پاس GPS کار میں ہوتا تھا۔ مگر اس کے باوجود آپ مصر ہوتے کہ اس جگہ رائٹ ٹرن لو، وہاں لیفٹ لو، یہ راستہ زیادہ آسان ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ راول ٹی وی کے منتظم فضل معین صدیقی ان انٹرویوز کو DVD پر تیار کر کے پروازی صاحب کے چاہنے والوں کو جلد فراہم سکیں گے۔ میرے نزدیک خود نوشتوں کے جائزہ کے بعد یہ ان کا زندہ جاوید کارنامہ ہے۔

سابق سفیر پاکستان سے ملاقات

پاکستان کے سابق سفیر کرامت اللہ غوری کی اہلیہ عابدہ کرامت 2016 میں جب وفات پا گئیں تو پروازی صاحب نے مجھے کہا کہ ان سے ملنے جانا ہے۔ چنانچہ ہم دونوں رچمنڈ ہل میں ان کے دولت خانے پر تعزیت کے لئے حاضر ہوئے۔ جناب غوری قلم اور گفتار کے غازی ہیں۔ ان کے دلچسپ علمی مضامین ٹورانٹو کے اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ نیز وہ مشاعروں اور اجلاسوں کی صدارت بھی کرتے ہیں۔ ملاقات کے دوران غوری صاحب نے ہمیں اپنی اہلیہ کے اشعار اور غزلوں کی تین چار کاپیاں دکھائیں۔ نابغہ روزگار ڈاکٹر عبد السلام پر جو مضمون غوری صاحب نے زیب قرطاس کیا تھا جو ان کی کتاب " بار شناسائی" میں درج ہے وہ میں نے اپنی تالیف "سلام عبد السلام" میں شامل کیا تھا۔ جاپان میں جہاں غوری صاحب قائم مقام سفیر تھے، ڈاکٹر سلام سے اپنی ملاقات کے متعلق وہ کہتے ہیں "ڈاکٹر سلام سراپا عجز و نیاز اور ہمہ تن انکسار تھے۔ آنکھوں میں فطری ذہانت کی روح پرور چمک،۔۔۔ جیسے بادل اپنی فیاضی میں خشک سے خشک تر زمین کو بھی سیراب کرنا

چاہتا ہو۔سائنس جیسے خشک اور بنجر میدان میں ان کی ظرافت طبع اور بذلہ سنجی خاصے کی چیز تھی۔"

شاعر خوش نوا مبارک احمد عابد سے ملاقات

چند سال پہلے جماعتی حلقوں میں جانے پہچانے غزل گو شاعر پروفیسر مبارک احمد عابد (میرے ہم جماعت) ٹورانٹو تشریف لائے تو پروازی صاحب نے مجھے یاد کیا۔ ہم دونوں مبارک عابد کو ان کے فرزند دلبند عدنان کے گھر سے لے کر ریستوران میں گئے اور کھانا کھانے کے بعد دیر تک کالج کی یادوں میں محو ہو گئے۔ پروازی صاحب کو تعلیم الاسلام کالج کا سنہری دور اتنا یاد آرہا تھا یا ستا رہا تھا کہ مبارک عابد سے صرف اسی موضوع پر بات چیت کرتے رہے۔ میٹھے میں آپ نے گلاب جامن منگوائے تو میں نے پوچھا آپ کو تو شوگر ہے؟۔ کہنے لگے میرے لیے یہ میٹھا کھانا ضروری ہے تا شوگر کم نہ ہو جائے۔ جسم کو مکمل طور پر شوگر سے محروم رکھنا مناسب نہیں۔ شوگر زیادہ ہو جائے تو اس کا تدارک ممکن ہے لیکن جسم میں شوگر کی کمی ہو جائے hypoglycemia ہو جائے تو اس سے ایسے نقصان کا احتمال ہوتا جو جان لیوا ہو سکتا۔ کینیڈا کا سفر نامہ جس میں آپ کی ظرافت طبع کی شیرینی ہر فقرے میں ٹپکتی نظر آتی ہے آپ نے لکھا کہ جب سے انسولین لگانے کی نوبت آئی ہے دعوتوں کی طرف رغبت کم ہو گئی ہے۔ بھلا میٹھا نہ کھایا جائے تو دعوت کیا ہوئی؟ اور میٹھا کھایا جائے تو انسولین کیا ہوئی؟

تصانیف اور رسائل

آپ نے بچپن میں ربوہ میں اپنے گھر کی بیٹھک میں چھوٹی سی لائبریری کی بنیاد ڈالی اور ربوہ کے علم دوست باسیوں سے کتابیں لے کر اس میں سجا دیں۔ پھر عوام کو دعوت عام دی گئی کہ وہ اس لائبریری کو دیکھنے ضرور آئیں۔ بچپن میں بچوں کیلئے ایک رسالہ شروع کیا جس کا نام مشعل تھا۔ یہ رسالہ لائبریری کی زینت بھی بنا۔

آپ نے پی ایچ ڈی 1947 تک اردو میں قلم بند کئے گئے ناولوں کے موضوع پر 1968 میں کی تھی۔ ایک بار انہوں نے مجھے بتایا کہ پی ایچ ڈی کرنے کے دوران لاہور میں کئی راتیں فٹ پاتھ پر سوتا رہا کیونکہ لاہور میں کسی سے اتنی واقفیت نہیں تھی اور تقسیم ہند کے پر آشوب دور کے بعد وسائل بھی نہیں تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بطور اظہار تشکر بتایا کہ پٹنہ کے احمدی فاضل اور عالم بے بدل پروفیسر ڈاکٹر اختر اورینوی (ڈی لٹ) نے ان کی مقالہ لکھنے میں فراخدلی سے مدد کی تھی۔ ہندوستان میں کتابوں اور رسائل و جرائد کی تلاش اور ان کے صفحات کی فوٹو کاپیاں یا ہاتھ سے نقل کروا کے لاہور بھجوائی تھیں۔

آپ کے نہایت دل چسپ اور عالمانہ مضامین عرصہ دراز تک الفضل ربوہ،، ہفت روزہ لاہور، ہفت روزہ نیا زمانہ، احمدیہ گزٹ کینیڈا و امریکہ، المنار ربوہ و امریکہ نیز پاکستان کے دیگر ادبی رسالوں اَوراق، علامت، ماہِ نو، کی زینت بنتے رہے جن کا شمار کرنا کار دارد ہے۔ سفینہ چاہیئے اس بحر بے کراں کے لیے۔ جب ایک مضمون کسی رسالے میں شائع ہوتا تو وہ اتنا عمدہ اور دلکش ہوتا کہ دیگر رسالوں میں بھی شائع ہوتا تھا۔ میری طرح ان کے سینکڑوں شاگرد یہ خرد افروز مضامین بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتے تھے خاص طور پر یاد رفتگاں والے مضامین۔ خاکہ نگاری بھی آپ کا طرہ امتیاز تھا۔ سفر ناموں میں بعض دفعہ طنز و مزاح بھی شامل ہوتا تھا۔ فطرت نے ان کو شگفتہ طبیعت ودیعت کی تھی۔

دوستوں شاگردوں کی محفل میں ہمیشہ ہنستے ہنساتے دیکھے گئے۔ ان میں مذاق کرنے اور مذاق سے لطف اندوز ہونے کی اچھی خاصی صلاحیت تھی۔ دل کا آپریشن بھی ہوا، مگر قلم کا یہ مجاہد یہ بازی بھی جیت گیا۔

ماہنامہ انصاراللہ۔ڈاکٹر عبد السلام خاص ایڈیشن

آج سے پندرہ سال قبل جب میں ربوہ میں تھا تو خلافت لائبریری میں ماہنامہ انصار اللہ جنوری۔فروری 1980 کا وہ خاص رسالہ خوش قسمتی سے مل گیا جس کے پرواز ی صاحب ایڈیٹر تھے۔ یہ ڈاکٹر عبد السلام کے نوبیل انعام ملنے کے بعد کی خاص اشاعت تھی۔ اس کی فوٹو کاپی میں نے کروالی۔ خاص بات یہ تھی کہ اس میں اشاریہ دیا گیا تھا یعنی نوبیل انعام کی خبر اور پاکستانی اخبارات میں چھپنے والی خبروں اور مضامین کا اشاریہ۔ یہ سات صفحات پر محیط ہے۔ اسکے علاوہ ڈاکٹر سلام کی سوانح حیات اور ڈاکٹر صاحب کو ملنے والے اعزازات کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

عالم اسلام کے بطل جلیل ڈاکٹر عبد السلام کی وفات پر پرواز ی صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا: "وہ شخص خاموش ہو گیا جو بولتا تھا تو دنیا خاموش ہو کر اس کو سنتی تھی۔ وہ سائنس کے اتھاہ سمندر کا کنارہ، طبیعات کے آسمان کا ستارہ، دل کا حلیم، اپنوں پرایوں پر مہربان، ذہینوں فطینوں کا قدر دان، اپنے وطن میں علم کے فروغ کا خواہش مند، جہالت کا دشمن اور علم کی روشنی سے بہرہ مند، اس کے اُٹھ جانے سے دنیا سے ایسا علم اُٹھ گیا۔ ان جیسوں کی موت کو زمانہ کی موت کہا جاتا ہے۔" (الفضل 9 جنوری 1997 صفحہ 4)

فخر پاکستان ڈاکٹر عبد السلام کی حسرت ناک وفات پر آپ نے نظم لکھی جس کے کچھ اشعار یہ ہیں

اس احمدی سے تعلق برادرانہ تھا   مرا سلام کا رشتہ بڑا پرانا تھا

وہ شخص بو علی سینا تھا اس زمانہ کا   وہ شخص دانش و حکمت کا اک خزانہ تھا

سلا دیا جسے مٹی میں ہم نے پچھلے پہر   وہ ایک شخص نہ تھا پورا اِک زمانہ تھا

(اخبار احمدیہ لندن)

آپ کی شاعری

آپ نے پاکستان، جرمنی، سویڈن، برطانیہ، کینیڈا اور امریکہ میں درجنوں مشاعروں کی صدارت اور نظامت کے فرائض سرانجام دئے۔

ایک دفعہ میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ نے ابھی تک مجموعہ کلام کیوں شائع نہیں کیا؟۔ فرمایا میری شاعری زیادہ تر جماعت احمدیہ کے متعلق ہے جو جماعت کے جرائد میں چھپ چکی ہے۔ اس لئے کوئی اور صاحب ذوق اس کام کو کرے۔ ”احمدیہ کلچر“ میں صفحہ 272 میں آپ نے لکھا "اول تو ہم مشاعرے پڑھتے نہیں، پڑھیں تو ہمیشہ تازہ ترین کلام سناتے ہیں۔ لوگوں کی طرح ایک ہی غزل کو بقول شخصے "رِی پیٹتے" نہیں چلے جاتے"۔

آپ کا ایک اعلیٰ پایہ کا ادبی مضمون ”پاکستان میں اردو ادب اور جماعت احمدیہ کا کردار“ پہلے ماہنامہ خالد (اگست 1997) اور پھر مکرر روزنامہ الفضل (4 نومبر 1997) میں شائع ہوا تھا۔ اس کے آخر پر آپ نے اپنی شاعری کے بارے میں لکھا ” راقم الحروف کو بھی نظم و نثر میں خدمت کی تھوڑی بہت توفیق ملتی رہی اور اس ہیچ مدان کے مضامین جماعت کے کسی ایک پرچے میں چھپنے کے بعد جماعت کے بہت سے دوسرے پرچوں میں اور دوسرے ممالک میں مکرر چھپتے رہے۔ نظموں کا سلسلہ یہ رہا کہ خاکسار جماعت کے پرچوں میں تو چھپتا رہا مگر ملک کے وقیع ادبی رسائل کے مدیران کے کہنے کے باوجود ان رسائل سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں اپنی شعری صلاحیت کو صرف جماعت احمدیہ کی خدمت کیلئے وقف رکھنا چاہتا ہوں اور ان مدیران نے ازراہ کرم میرے اس عذر کو قبول کر لیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ ادبی جرائد نے جماعت کے پرچوں میں چھپنے والی کسی چیز کو اپنے پرچوں میں مکرر چھاپ کر میری عزت افزائی فرمائی۔ جماعت احمدیہ کے بہت سے شعراء کے مجموعہ ہائے کلام پر تعارفیے لکھنے کی توفیق ملتی رہی۔“

آپ کی تصانیف

آپ کی علم کے لعل و گوہر سے بھرپور تصانیف جو آپ نے 1964-2010 تک تصنیف کیں ان کی فہرست پس نوشت جلد سوم کے پس پشت جلد پر دی گئی ہے۔ اس کے مطابق تعداد 16 بنتی ہے جس میں قران کریم کا اردو ترجمہ (غیر مطبوعہ) حبل الورید شامل ہے۔ اردو، انگلش، عربی، فارسی پر آپ کو مکمل عبور حاصل تھا۔

جاپان کے متعلق آپ نے چھ کتابیں ترجمہ و تصنیف کیں جیسے سورج کے ساتھ ساتھ (سفر نامہ) اور جاپان کا سب سے لمبا دن۔

تحریک آزادی میں سر ظفر اللہ کا حصہ کتاب 2002 میں شائع ہوئی تو اس کے اعترافات میں یعنی کتاب کی تکمیل و اشاعت میں حصہ لینے والے دیگر شاگردوں کے ساتھ اس عاجز کا بھی ذکر فرمایا تھا۔

احمدیہ کلچر۔ میں آپ کی یہ 307 صفحات پر مشتمل کتاب 2005 منظر عام پر آئی۔ اس کا موضوع احمدیوں کے سماجی، معاشرتی، اور دینی رویوں کا جائزہ ہے جس کی بنیاد قادیان اور ربوہ کے ماحول کے مطالعہ پر رکھی گئی ہے۔ دیباچہ میں آپ نے لکھا ”اب وہ چیزیں جو تقریباً تین سو مضامین کی صورت میں سلسلہ کے مختلف رسالوں اخباروں میں بکھری پڑی تھیں کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہیں۔“ یہ فی الحقیقت جماعت احمدیہ کے Who's Who اسماء الرجال کا جامع انسائیکلوپیڈیا ہے۔ ذرا مضامین کے عنوان ملاحظہ فرمائیں، میرا مرشد، کچھ بے نفس لوگ، مددگار کارکن، ہمارے دکاندار، جلسہ سالانہ اور آب خورے، ربوہ کے احمدی شعراء، قدم قدم تیری یادیں۔ یہ کتاب آپ نے اپنے

آٹو گراف کے ساتھ راقم کو عنایت فرمائی جس پر 2 دسمبر 2005 تاریخ درج ہے۔

ایک دفعہ راقم الحروف آپ کو کسی دوست سے ملوانے کے لیے مسی ساگا میں آپ کی قیام گاہ پر پہنچا۔ کوئی مضمون ٹائپ کر رہے تھے اپنے سٹڈی روم میں انتظار کرنے کو کہا جو بھانت بھانت کی کتابوں سے فرش سے چھت تک کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بستر پر بھی کتابیں تھیں۔ کمپیوٹر پر ٹائپ میں ذرادِقت ہوتے دیکھ کر بتایا کہ میری ایک آنکھ میں مکمل بینائی نہیں اس لیے ایک آنکھ سے ہی کتنے سالوں سے یہ کام کر رہا ہوں۔ ہر مضمون in-page پر خود ٹائپ کر کے رسائل کو ای میل کرتے تھے۔عاجز نے آپ کو احمدی سکالر محمد عطاء اللہ کی خود نوشت Citizen of the Two Worlds بڑی مشکل سے تلاش کر کے فراہم کی جو ان کے لیے باعث مسرت ہوا تھا۔جب کسی سے بے تکلفی ہو جاتی تو اس سے "یار کہہ "کر مخاطب ہوتے بشمول مجھ جیسے شاگردوں سے۔ مجھے وہ پر تکلف دعوت بھی یاد آرہی ہے جب آپ نے ملک لال خاں، کرنل (ر) محمد اسلم، سجاد ملک، ہدایت اللہ ہادی اور راقم السطور کو مسی ساگا میں اپنی رہائش گاہ پر مدعو کیا تھا۔ اس کے بعد آپ کے لطیف مزاح کی پھلجھڑیاں چلتی رہیں اور محفل زعفران زار بنی رہی۔ ان کے پر مزاح جملے ہلکی سی چٹکی لینے کے مترادف ہوا کرتے تھے۔ جب کبھی اپنی ہونہار بیٹی کو ملنے کے لیے آتے جو میرے گھر کے قریب رہتی تھی تو مجھے فون کر دیتے۔

”پس نوشت“ کے چار ایڈیشنز

پس نوشت ۔ اردو کی اہم خود نوشتوں کا جائزہ۔ چار جلدوں میں اردو میں رقم کی جانے والی 316 آپ بیتیوں کا احاطہ کیا گیاہے۔ آپ نے بڑے شفقت سے ہر نئے ایڈیشن پر دستخط فرمائے اور مجھے مرحمت فرمائی۔ یہ کتابیں لاہور سے شعیب عادل ایڈیٹر نیازمانہ لاہور نے شائع کی تھیں۔شعیب عادل نے راقم کی چھ کتابیں بھی شائع کی تھیں۔ اس کے علاوہ درجنوں احمدی مصنفین اور شاعروں کی کتابیں شعیب نے لاہور سے شائع کی تھیں مگر کچھ سالوں بعد شعیب بھی وطن میں تعصب اور شدت پسندی کا شکار ہو گئے جب تین سو سے زیادہ بلوائیوں نے علماء کے اکسانے پر ان کے دفتر پر حملہ کر دیا۔ بڑی مشکل سے ان کی جان بچی۔ اس خوف اور کڑے وقت میں پروازی صاحب بہت فکر مند ہوئے کہ اس کا ذریعہ معاش جاتا رہا۔ ہم دونوں نے ان کی مالی مدد کی تھی۔ آج کل شعیب عادل میری لینڈ امریکہ میں مقیم ہیں، اور نیا زمانہ امریکہ سے شائع کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر داؤد رہبر کا تبصرہ

قاموسی نوعیت کی یہ تصنیف پس نوشت یعنی اردو کی آپ بیتیوں پر پروفیسر ڈاکٹر داؤد رہبر (1926-2013) کا تبصرہ رسالہ نیازمانہ میں شائع ہوا تھا۔ داؤد رہبر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ برطانیہ ، امریکہ کینیڈا میں چار دہائیوں سے تقابلی مقابلہ ادیان کے پروفیسر تھے اور متعدد کتابوں کے مصنف۔ میں نے ستر کی دہائی میں ان کی علمی کتاب گاڈ آف جسٹس پڑھی تھی جو کہ معرکہ آراء تصنیف ہے ۔ آپ نے اپنی اردو کتابوں کا انگلش میں ترجمہ کیا نیز غالب کے خطوط کا بھی۔ آپ کی تصنیف ” پراگندہ طبع لوگ“ آن لائن ہمارے دوست اور کرم فرما سفیر رامہ کی apnaorg.com ویب سائٹ پر پڑھی جا سکتی ہے۔

”آج سے آٹھ برس پہلے پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب نے اپنی تصنیف پس نوشت کی جلد اول تحفہ مجھے بھیجی تھی۔ میں نے انہماک سے اس کا مطالعہ کیا۔ ادبیات کے اصناف میں سب سے بڑھ کر میری دل بستگی سوانح عمریوں سے ہے۔ ڈاکٹر پروازی صاحب کا شغف ان کی بجائے آپ بیتیوں سے ہے۔ آپ بیتیوں کی تحقیق میں سبقت کا سہرا آپ کے سر ہے۔ پس نوشت کی جلد اول پڑھ کر میں نے 12 جنوری 2004 کو انہیں ایک خط لکھا پھر ایک برس بعد جلد دوم کا مسودہ ملا تو 20 مئی 2005 کو انہیں شکریہ کا خط لکھا۔ دونوں خطوط میں آپ کی کار گزاری کی داد دی۔ جلد دوم کی طباعت کے وقت آپ نے میرے دونوں خطوط اس میں شامل کر دیے۔ بعد ازاں جلد سوم اور جلد چہارم کے عطیے بھی ان کی طرف سے موصول ہوئے۔ جلد سوم 2010 میں شائع ہوئی اور جلد چہارم 2012 میں۔

جن آپ بیتیوں کا ان چار جلدوں میں تجزیہ کیا گیا ہے ان میں تعلقات بشری کے تنوع کی خبر ملتی ہے۔ رحمدلی، بے رحمی، غرور، فروتنی، خیرات، بخل، بغض، زودرنجی، دلیری، بزدلی، ریاکاری، اخلاص، انتقام، حرص، قناعت، توکل، کنبہ پروری کی مثالیں فراہم کی گئیں ہیں۔ اردو کی تہذیب کا ایک خاص فیچر ہے باحیثیت اور برگزیدہ بزرگوں کے لئے تکریم جمع کا استعمال مثلاً آل احمد سرور لکھتے ہیں رشید احمد صدیقی لاہور تشریف لائے۔ آل احمد سرور لکھتا ہے کوئی نہ کہے گا، تکریم کا یہ التزام انگریزی میں نہیں۔

جن آپ بیتیوں سے ڈاکٹر پروازی نے ہمیں متعارف کرایا ہے بیسویں صدی کے ہندوستانی اور پاکستانی معاشرہ کی عکاسی ہیں۔ اس معاشرہ کا اساسی نظام اب بادشاہی والا نہیں بلکہ جمہوریت آمادہ ہے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ اس میں جمہوریت کا ڈھونگ ہے، جمہوریت ان دونوں ملکوں میں تشکیل پذیر ہے۔ سیاسی تحریکوں کی کشاکش ان میں سلطانی جمہور کا مضحکہ خیز ناٹک ہو کر ہمارے سامنے ہے۔

ڈاکٹر پروازی کو مبداء فیض سے چوکس دماغ اور توانا حافظہ عطا ہوا ہے۔ آپ نے لگن کے ساتھ آپ بیتیوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ان سے دلچسپ اور مفید مطلب اقتباسات آپ نے تجزیہ میں مسلسل شامل رکھے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کلچرل اور سیاسی ہنگاموں سے بندہ ساٹھ برس دور رہا ان ہنگاموں کی خبر مجھے یہ چار جلدوں میں پڑھ کر ملی۔

ڈاکٹر پروازی کی اس تصنیف کی آخری جلد (جلد چہارم) میں مندرجہ ذیل قلمکار طبقات کی نمائندگی ہوئی ہے: معلمین (تعداد 16)، ادبی شخصیات (تعداد 9)، فوجی افسر (4)، وابستگان سیاست (7)، پولیس (2)، سفیر (2)، صحافت پیشہ (3)، براڈ کاسٹر (5)، میڈیکل ڈاکٹر (2)، سرکاری عہدیدار (4)، سائنس کے پرستار (4)، فضائیہ (2)، دین کے مبلغ (2)۔

طبقات کا یہ شمار صرف جلد چہارم کے حوالے سے ہے۔ اس جدول کو ملاحظہ کر کے اندازہ ہو جائیگا کہ سابقہ تین جلدوں میں خود نوشت لکھنے والے کن متفرق میدانوں کے لوگ ہیں۔“ (نیا زمانہ اپریل لاہور 2013، صفحات 41/40)

آپ بیتیوں پر ٹورانٹو میں مذاکرہ

حلقہ ارباب قلم ٹورانٹو کے زیر اہتمام 8 مارچ 2020 کو ایک مذاکرہ منعقد ہوا، اس کا موضوع پروازی صاحب کی خود نوشتوں کا جائزہ تھا۔ پروازی صاحب کے تعارف کے بعد سوال و جواب کا لمبا سلسلہ تھا۔ حاضرین سوال کرتے اور پروازی صاحب تسلی بخش بالتفصیل جواب

دیتے۔ اس اجلاس میں پروازی صاحب نے اپنے دقیق علمی پراجیکٹ کے آغاز کے متعلق فرمایا: ”جب میں جاپان سے واپس آیا تو انہوں نے مجھے بہاول نگر بھیج دیا۔ میں چپ کر کے بیٹھ گیا اور سوچا زیادہ سے زیادہ وہ مجھے ملازمت سے نکال دیں گے۔ تو اس وقت میں نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کیلئے سوانح عمریوں کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ سوانح عمری اور خود نوشت سوانح میں فرق ہوتا ہے۔ زید یا بکر آپ کے حالات لکھے تو وہ سوانح عمری ہے۔ لیکن اگر آپ خود اپنی زندگی کے حالات لکھیں تو اس میں آپ پر بہت ذمہ داری آجاتی ہے۔ کیونکہ انسان اگر اپنے بارے میں بات کرتا ہے تو کچھ مبالغہ بھی ہو گا ظاہر ہے اپنے بارے میں ایسی باتیں ہی بیان کرنا ہو گا جو اچھی لگتی ہیں۔ وہ ایسی باتیں نہیں بیان کریگا جو اس کو اچھی نہیں لگتیں۔ سوانح عمریوں اور خود نوشتوں میں بڑا نازک فرق ہے جس کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ تو اس ضمن میں میرا پہلا مضمون لاہور کے رسالہ علامت میں چھپا۔ وہ مضمون چھپنے کی دیر تھی کہ اس پر بحث شروع ہو گئی کہ سوانح عمری اور خود نوشت میں یہ فرق کیوں ہے“ اب سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا جو قریب دو گھنٹے تک جاری رہا۔ (راقم کے پاس یہ ویڈیو ہے، یاد رہے کہ اس وقت پروازی صاحب اس حسین وشاداب زندگی کی 84 بہاریں دیکھ چکے تھے۔ مگر حافظہ نشتر کی دھار کی طرح تیز، کاش استاد محترم اپنی خود نوشت ضبط تحریر میں لے آئے ہوتے تو یادگار چیز ہوتی)۔

کتاب گلدستہ خیال پر تبصرہ

میری جب بھی کوئی نئی کتاب منصہ شہود پر آتی (تادم تحریر 25 کتابیں طبع ہو چکی ہیں) تو میں کچھ آپ کی نذر کرتا، تو ہمیشہ خوشی کا اظہار فرماتے تھے۔ گلدستہ خیال جو کہ جماعت احمدیہ کے نامور مبلغ بشیر احمد آرچرڈ کے افکار و خیالات پر مشتمل مضامین کے مجموعہ کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب پر آپ نے جنوری 2003 میں تبصرہ فرمایا ”عزیزی زکریاوِرک اپنے رنگ میں ادب اور سلسلہ کی خدمت جاری رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ پچھلے چند برسوں میں انہوں نے پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کے بارہ میں بہت سارا مفید مواد جمع کر کے شائع کیا ہے تاکہ مستقبل کے مؤرخ کیلئے آسانی رہے۔ ہم لوگ بہ حیثیت قوم احسان ناشناس قوم ہیں اس لئے کسی احمدی کے کارہائے نمایاں کو خواہ وہ سورج کی طرح ظاہر وباہر کیوں نہ ہو تعصب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ الاماشاءاللہ۔ کچھ سائنس دان ایسے بھی ہیں جو سچ کو سچ کہہ دیتے ہیں مگر ایسے لوگ شاذ کالمعدوم کے حکم میں ہیں۔ اس سلسلہ کا آخری مضمون جو میری نظر سے گزرا وہ ان کی بیٹی کے مضمون کا ترجمہ ہے عزیزم زکریا نے ہفت روزہ لاہور میں شائع کروایا ہے۔ زکریا ادبی اور علمی ذوق کا آدمی ہے اور مجھے خوشی ہے کہ اس ذوق کی آبیاری میں کوتاہی نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ اسے بیش از بیش خدمت کی توفیق دے۔ علمائے ادب نے یہی کہا ہے کہ نافع الناس وجود کہیں بھی ہو اجنبی نہیں رہتا کہ جہاں جاگزیں ہو اپنے فیض کا چشمہ جاری کر دیتا ہے۔ ادبی ذوق کے لوگ بھی اسی دائرے میں آتے ہیں کہ دنیاوی مشاغل سے جو وقت اور فرصت ملے اسے ادبی کاموں میں صرف کرتے اور خلق خدا کے لئے نافع الناس چیزیں جمع کرتے اور انہیں اپنے قلم کے ذریعہ بانٹتے رہتے ہیں۔ کینیڈا کی جماعت میں اللہ کے فضل سے بہت سے ایسے نافع الناس وجود جمع ہو گئے ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے رنگ میں جماعت کے علم کلام میں اپنا حصہ ڈالتے رہتے ہیں۔ عزیزی زکریاوِرک ایسے لوگوں میں سے ایک ہے"۔ ایک شاگرد کے لئے اپنے استاد محترم کے ایسے الفاظ نہ صرف

باعث افتخار بلکہ کسی اعلیٰ اعزاز سے کم نہیں۔

فیصل آباد کے طالبعلم کا استاد کو خراج عقیدت

بزرگوارم محترم پروازی صاحب (1936-2023) کی وفات پر فیصل آباد کے ایک طالبعلم ناصر عباس نیر نے درج ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے "مجھے پروازی صاحب کی کلاس کا انتظار رہتا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ باقی اساتذہ اردو ادب ہی نہیں خود تعلیمی عمل سے بے رغبتی کا سبب تھے۔ پروازی صاحب ان سب کی تلافی تھے۔ وہ اپنے ساتھ کئی کتابیں اٹھا کر لاتے۔ پہلے موضوع کا تعارف کراتے۔ پھر اس کی وضاحت کرتے اور ضرورت پڑنے پر متعلقہ کتب سے اقتباس پڑھتے۔ وہ درست معلومات کے ساتھ ساتھ ادب سے متعلق بصیرت بھی بہم پہنچاتے جاتے۔ ادب مسرت اور بصیرت، لذت اور روشنی بہ یک وقت پہنچاتا ہے۔ یہ سچائی ان کے ایک ایک جملے سے پھوٹی پڑتی۔ وہ ادب پڑہاتے ہوئے ادب کی روح نہیں کچلتے تھے۔ یعنی وعظ و نصیحت نہیں کرتے تھے۔ ان کی آواز گرج دار تھی۔ لہجہ نستعلیق تھا اور عمومی رویہ نہایت ہمدردانہ اور مشفقانہ تھا۔ اسی کالج میں پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ ایک استاد، طالب علم کا سچا خیر خواہ ہو سکتا ہے تو دوسری طرف کوئی دوسرا استاد اس کا پکا حریف بھی ہو سکتا ہے۔ پروازی صاحب کا کمرہ ہر وقت طلباء و طالبات سے بھرا رہتا۔ وہ صرف ادب پر گفتگو کیا کرتے۔ وہ ہر طالب علم کا باقاعدہ استقبال کیا کرتے۔ کھڑے ہو جایا کرتے۔ ہم سب شرمندہ بھی ہوتے اور تفاخر بھی محسوس کیا کرتے"۔
http://www.mukaalma.com/180810

میں اس حدیث دلپذیر کو پروازی صاحب کی غزل کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں۔ الفضل ربوہ 5 اپریل 1997

تمہاری یاد کے بکھرے ہوئے گہر ہم نے
پروئے تار نفس میں لڑی لڑی کرکے
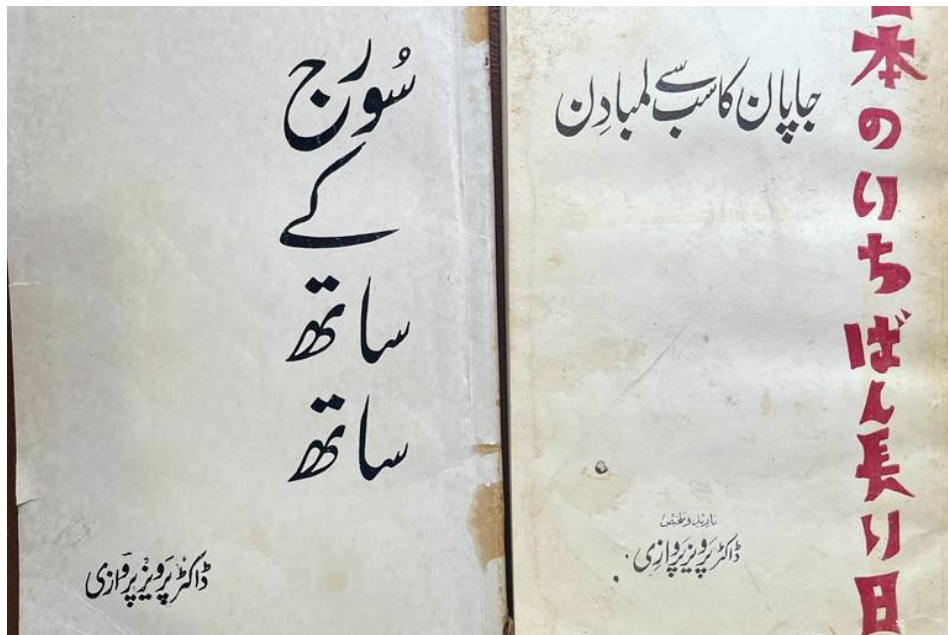
پروفیسر ڈاکٹر محمد شریف خان

تعلیم الاسلام کالج۔۔۔میری یادوں کا گہوارہ

انسان بچپن میں مستقبل کے لئے تگ و دو، جوانی میں حالات پر کنٹرول کرنے اور بڑھاپے میں ماضی کی کہانیوں میں گُم رہتا ہے۔
نقاشِ فطرت نے اشرف المخلوقات کے لئے زندگی کے ہر دور میں دلچسپیاں اور ان کے حصول کی لگن لگادی ہے کہ یہ حضرت زندگی بھر ان بگولوں میں گزشتہ خواہشوں کے بے ہنگم اُڑتے تنکوں کو پکڑنے کا جتن کرتا رہتا ہے، لمحوں کو سلسلہ وار ڈھلتا ہوا دیکھتا رہتا ہے، اور ایک دن بالآخر سکون پکڑ لیتا ہے۔ بنجارہ لاد چلتا ہے، کہانی ختم ہو چکتی ہے۔ تلاتم تھم جاتا ہے، سکون چھا جاتا ہے!
جب کبھی بچپن کی روپہلی وادیوں کے سحر میں خیالوں خیالوں میں گم ہوتا ہوں، وہ دن میری سوچوں میں بار بار در آتا ہے، جب شروع سال 1946 میں مجھے پرائمری تعلیم الاسلام سکول میں داخل کر دیا گیا۔ میرے لیے سکول اور سکول کا ماحول ایک حیرت کدہ سے کم نہ تھا۔ گھر میں تو والدہ کی تادیب سے ادھر اُدھر ہو کر بچا جا سکتا تھا، مگر سکول میں ماسٹر صاحب کی تادیب سے بچنا ممکن نہ تھا۔

تعلیم الاسلام پرائمری سکول

ہماری کچی پہلی جماعت، تعلیم الاسلام کالج اور ہائی سکول کی درمیانی حد پر واقعہ درختوں کی قطار میں واقعہ ایک گھنی چھاؤں والے شیشم کے درخت کے نیچے لگا کرتی تھی۔ سکول کھلنے سے پہلے کلاس کا مانیٹر دو تین لڑکوں کو ساتھ لیے سکول کے سٹور سے چٹائیاں، بلیک بورڈ اور ما

سٹر صاحب کی کرسی اٹھوا لاتا۔اس دوران دعا کی لمبی گھنٹی بجتی اور ہم سکول کے سامنے اسمبلی کے میدان میں اپنے اپنے مانیٹر کے پیچھے جا قطاروں میں کھڑے ہو جاتے۔

تین لڑکے ڈائس پر نمودار ہوتے اور بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ دعا کے درجِ الفاظ کہلواتے:

مری رات دن بس یہی اک صدا ہے
کہ اس عالَم کون کا اک خدا ہے
اسی نے ہے پیدا کیا اس جہاں کو
ستاروں کو سورج کو اور آسماں کو
وہ ہے ایک اس کا نہیں کوئی ہمسر
وہ مالک ہے سب کا وہ حاکم ہے سب پر

دعا کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب کچھ اعلان کرتے اور ہم اپنی کلاسوں میں آ بیٹھتے۔

ہماری کلاس کے انچارج محترم ماسٹر محمد بخش سولنگی مرحوم تھے۔ محترم ماسٹر صاحب گاؤں سے سائیکل پر تشریف لاتے۔مانیٹر کے "کلاس سٹینڈ" کے جواب میں ساری کلاس کھڑی ہو جاتی، مانیٹر آگے بڑھ کر سائیکل پکڑ کر درخت کے تنے کے ساتھ لگا کر کھڑا کر دیتا۔

کلاس کی حاضری ہوتی، لبیک۔لبیک!

اور باقاعدہ پڑھائی کا آغاز قاعدہ یسرنا القرآن کے سبق سے ہوتا، پھر نماز دُہرائی جاتی، ماسٹر صاحب آموختہ سنتے، پھر اُردو، حساب وغیرہ کا سبق ہوتا۔ماسٹر صاحب کُرتے کی سائیڈ جیب سے موٹی سی مسواک نکالتے اور آموختہ نہ سنا سکنے والوں کو مسواک کی چند ضربات سے سزا دیتے اور آئندہ یاد کرنے کی تلقین کرتے۔ محترم ماسٹر صاحب نہایت سادہ طبیعت، شفیق، سفید، ڈھیلی ڈھالی پگڑی، قمیض اور تہمد میں ملبوس، بڑی محبت سے پڑھاتے۔ماسٹر صاحب کا مسکراتا ہوا چہرہ اب تک مجھے یاد ہے۔اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔ آمین۔

تفریح کی گھنٹی کے ساتھ ہی ہم بستے سے لنچ کا ڈبہ نکالیتے، کھانے سے فارغ ہوتے ہی ظہر کی نماز کا وقت ہو جاتا، مسجد نور سے اذان کی آواز بُلند ہوتے ہی سکول اور کالج کے طلباء قطار در قطار مسجد نور پہنچتے، مسجد بھر جاتی، نماز کے بعد درس ہوتا، اور ہم قطار در قطار اپنی کلاسوں میں پہنچ جاتے۔ پڑھائی شروع ہوتی، عام طور پر صبح پڑھا ہوا سبق دُہرایا جاتا، آخری پیریڈ شروع ہونے کے ساتھ ہی ہم دو گروپوں میں بٹ جاتے اور اک دونی دونی، اک ستا ستا۔۔۔۔۔پہاڑوں کا یہ سلسلہ چھٹی کی لمبی گھنٹی کے ساتھ ختم ہو جاتا۔ ہم چٹائیاں وغیرہ لپیٹ کر سٹور میں پہنچا دیتے، اور بستے لیے مشرق، شمال کا رُخ کرتے، گرد آلود فضا کچھ دیر بعد صاف ہو جاتی۔

بچپن کی خواہشیں

تعلیم الاسلام ہائی سکول کی سادہ سی عمارت کے مقابل کالج کی شاندار بارعب عمارت کے کشادہ اور وسیع برآمدے اور لمبی لمبی راہداریاں ہم جیسے کچی پکی میں پڑھنے والوں کو کھلے عام چھپن چھپائی اور بھاگ دوڑنے کی دعوت دیتے۔ دو تین بار پہریدار نے سرزنش کی۔ اور ہماری شامت کہ ہمیں بھائی منیر (جو کہ بی ایس سی کے طالب علم تھے) اسوقت لیبارٹری میں پریکٹیکل کر رہے تھے نے مجھے وہاں بھاگتے دوڑتے دیکھ لیا، بس گھر گئے خوب کھچائی ہوئی اور ہمارے لیے کالج میں داخلہ ممنوع ٹھہرا لیکن ہمارے دوست اس نعمت سے چھپتے چھپاتے برابر مستفید ہوتے رہے۔ ہم تھے کہ کالج کی شاندار عمارت کا دور دور سے نظارہ کیے رہتے۔

سکول میں داخلے سے پہلے بڑی آپا نے بتایا تھا کہ سکول سے کالج کہیں بڑا ہوتا ہے، سکول میں بچے اور کالج میں بھائی جان پڑھتے ہیں۔ جب سکول پاس کر لیتے ہیں تو کالج میں داخلہ لیتے ہیں۔ بڑی بڑی کتابیں پڑھتے ہیں (پھر سمجھ آئی کہ بھائی منیر کی میز پر اتنے بڑے بڑے "کتابے" کیوں پڑے رہتے ہیں)۔ بھائی منیر کا کمرہ بیٹھک کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا، جس میں تصویروں سے مزّین کتابیں اور رنگ برنگ تصویروں والے رسالے بھی تھے۔ شومیٔ قسمت میں نے ایک رسالہ کھسکا لیا اور تصاویر کاٹ لیں۔ آخر پکڑا گیا، کھچائی ہوئی اور بھائی جان کے کمرے میں داخلہ ممنوع ٹھہرا۔

Muhammad S. Khan

بدلتے وقت

جیسے موسمِ گرما کی چھٹیاں شروع ہوئیں، گھر میں اکثر بڑے آپس میں ہم بچوں کی سمجھ سوچ سے بالا ہندوستان، پاکستان اور پارٹیشن کی یا جو کچھ قادیان میں ہو رہا تھا باتیں کرتے۔ ہمیں گھر سے نکلنے کی مناہی تھی، سڑکوں گلیوں میں ٹریفک میں سامان اور لوگوں سے لدے گڈے آشامل ہوئے تھے۔ مسجد میں جانا منع ہو گیا تھا، سب لوگ نماز وغیرہ گھر میں پڑھتے۔ ایک دن آنکھ بچا کر مسجد میں چلا گیا۔ مسجد

میں قادیان کے ارد گرد کے علاقے سے آئے لوگ رہ رہے تھے۔ خوف و حراس پھیل رہا تھا۔

آخر ایک دن ہم بسوں کے ذریعے لاہور پہنچے، وہاں سے اپنے گاؤں چکسان، اور پھر میرا پڑھائی کا سفر گکھڑ منڈی سے ہوتا ہوا تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی سادہ سی عمارت سے ہوتا ہوا اسلامیہ کالج سول لائینز، اور پنجاب یونیورسٹی لاہور پہنچا۔ اس لمبے سفر کے دوران میرا بچپن کہیں گم گیا، اور میں آپا کے کہنے کے مطابق بھائیجانوں کے کالجوں میں پڑھتا ہوا بھائی جان بن گیا۔۔۔۔۔اور تعلیم الاسلام کالج میں 1963 میں پڑھانے پر معمور ہوا۔

مجھے 1946 سے لیکر 1963 کا عرصہ تعلیم الاسلام پرائمری سکول سے تعلیم الاسلام کالج پہنچنے میں لگا، اور پھر یہاں 1999 تک پڑھاتا رہا۔ جب پیچھے نظر کرتا ہوں تو دعائیں اور مقصد سے لگن کو پیچھا کیے ہوئے پاتا ہوں الحمد للہ۔

اے جذبہ ءدل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے
منزل کے لئے دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے

Talimul Islam College Alumni, USA
2nd
general meeting

2nd
general meeting

عارف وقار

بی بی سی اردو ڈاٹ کام، لاہور 11 جولائی 2010

اُردو خود نوشت، ایک قدم آگے
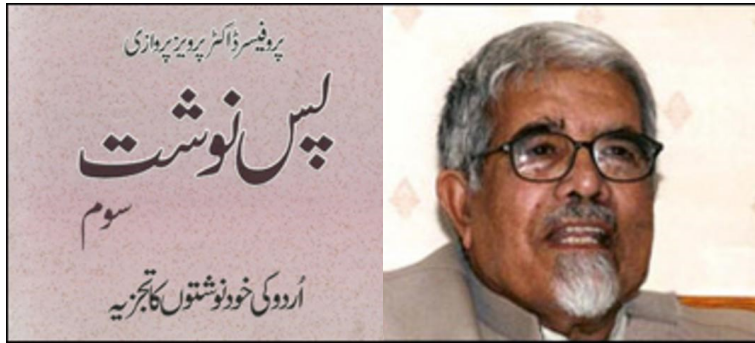
جن لوگوں نے نوجوانی میں پاکستان بنتے دیکھا تھا وہ نئی صدی کے آغاز تک سترّ اسّی برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔اِن میں سے جو لوگ پاکستان آکر اعلیٰ عہدوں تک رسائی حاصل کر سکے یا علمی ادبی شعبوں میں نام کما سکے اُن کے لئے اکیسویں صدی کا آغاز، پلٹ کر ماضی کی طرف دیکھنے کا لمحہ تھا۔ ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ کر ان میں سے کچھ لوگوں نے اپنے حالاتِ زندگی رقم کرنے کی ٹھانی اور یوں اُردو کے افق پر گزشتہ بیس پچیس برس کے دوران رنگ رنگ کی خود نوشت سوانح عمریاں جلوں افروز ہوئیں۔

ڈاکٹر پرویز پروازی کو اس صنفِ ادب سے طبعی لگاؤ ہے اور انھوں نے بڑی سنجیدگی سے اردو سوانح عمریوں کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ سات برس پہلے اُن کے تجزیوں کا اولین مجموعہ منظرِ عام آیا تو ہاتھوں ہاتھوں لیا گیا۔ اُس میں جن ستر سوانح عمریوں کا ذکر تھا وہ حسین احمد مدنی،

شورش کاشمیری، زیڈ اے بخاری، سر ظفر اللہ خان، قدرت اللہ شہاب اور جنرل جہاں داد سے لیکر دیوان سنگھ مفتون، جوش ملیح آبادی، کشور ناہید اور رام لال کے بیان کردہ حالاتِ زندگی کا احاطہ کرتی تھیں۔

سوانح عمری کا شوق ڈاکٹر پروازی کو اس میدان میں بہت آگے تک لے گیا اور انھوں نے اگلے پانچ برسوں میں احمد ندیم قاسمی، احسان دانش، مختار مسعود، شیخ ایاز، امرتا پریتم، قرۃ العین حیدر، اے حمید، الطاف گوہر، ڈاکٹر کرن سنگھ، مسعود کھدر پوش اور جسٹس منیر سے لیکر جنرل روئیداد خان، جنرل عتیق الرحمٰن اور پرویز مشرف تک کی خودنوشت سوانحِ عمریاں کھنگال ڈالیں۔

کتاب کے اس دوسرے ایڈیشن میں نئی اور پرانی کل ملا کر ایک سو اکاون سوانح عمریوں کا انتہائی باریک بینی اور عرق ریزی سے تجزیہ کیا گیا تھا۔ اس موقعے پر راقم نے لکھا تھا:

'۔۔۔ایک ایسے زمانے میں جب تحقیق و تفتیش کی گہرائی اور حقائق کی کھوج میں محقق کی عرق ریزی، ماضی کے افسانے بن چکے ہیں، ڈاکٹر پروازی کا یہ کارنامہ ہر طرح سے سراہنے کے قابل ہے، لیکن ساتھ ہی اُن ریٹائرڈ سرکاری افسروں، جرنیلوں اور سیاست دانوں کے لئے ایک لمحہء فکریہ بھی ہے جو آج کل اپنی خودنوشت کے لئے نوٹس تیار کر رہے ہیں کیونکہ ڈاکٹر پروازی ایک ہاتھ میں چھلنی اور دوسرے میں محدّب عدسہ لئے ہر نئی آنے والی آپ بیتی کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔۔۔'

اِس وقت جبکہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں اُس چھلنی اور محدب عدسے کے نتائج واضح ہو چکے ہیں اور پروازی صاحب کا تیسرا تحقیقی کارنامہ 'پس نوشت سوم' منظرِ عام پر آچکا ہے جس میں میر تقی میر سے لیکر قتیل شفائی تک، موسیقار نوشاد سے لیکر مغنیہ ملکہ پکھراج تک معروف پبلشر مولوی فیروز الدین سے لیکر فلمی مصنف سکے دار تک اور ملک معراج خالد سے لیکر اے پی جے عبدالکلام تک کوئی ستّر شخصیات کی خودنوشت سوانح عمریوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

خودنوشت لکھنے والا عموماً اپنی یادداشت کی بنیاد پر بیتے ہوئے واقعات کی تفصیل رقم کرتا ہے۔ ویسے بھی اسے تاریخی تناظر سے زیادہ اپنے ذاتی نقطہء نگاہ کی فکر ہوتی ہے چنانچہ اسکی تحریر میں ایک مورخ اور محقق والی واقعاتی صحت اکثر مفقود ہو جاتی ہے، لیکن ڈاکٹر پرویز پروازی اسے کوئی معمولی کوتاہی سمجھ کر درگزر کرنے کے قائل نہیں ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک یہ آپ بیتیاں مستقبل کے مورخ کو قومی تاریخ کا خام مال فراہم کرنے کی ذمہ دار ہیں اور یہ مال کھرا اور خالص نہیں ہوگا تو قومی تاریخ کا ریکارڈ بھی درست نہ رہ سکے گا۔

چنانچہ یوسف رضا گیلانی کی خودنوشت 'چاہِ یوسف سے صدا' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کارگل کے مسئلے پر گیلانی صاحب کی معلومات یک طرفہ اور نامکمل ہیں۔ (گیلانی صاحب) لکھتے ہیں 'نواز شریف پر اپنی فوجیں واپس بلانے کے لئے سفارتی سطح پر عالمی دباؤ بڑھ گیا تو انھوں نے امریکہ کے صدر کلنٹن سے ہنگامی طور پر ملاقات کی اور انھیں آگاہ کیا کہ اگر کارگل سے فوج واپس بلائی گئی تو فوج کی طرف سے شدید ردِ عمل کا خدشہ ہے۔ صدر کلنٹن نے انھیں اس خدشے سے محفوظ رکھنے کی یقین دہانی کرائی لیکن فوجیں واپس بلانے پر مُصر رہے۔ وائٹ ہاؤس میں ون ٹُو ون ملاقات کے فوراً بعد مشترکہ اعلامیے میں صدر کلنٹن کی موجودگی میں نواز

شریف کو فوجیں واپس بلانے کا اعلان کرنا پڑا۔'

یوسف رضا گیلانی کے اس بیان پر ڈاکٹر پروازی لکھتے ہیں: 'مجھے وثوق ہے کہ گیلانی صاحب نے اُس وقت تک صدر کلنٹن کی خودنوشت 'مائی لائف' نہیں دیکھی ہوگی۔ کلنٹن صاحب نے صاف لکھا ہے: 'نواز شریف نے چار جولائی کو امریکہ آنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے انھیں کہا کہ چار جولائی کو انھیں صرف اُس صورت میں امریکہ آنے کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ پیشگی اس بات کی یقین دہانی کرائیں کہ وہ کارگل سے اپنی فوجیں حتمی طور پر واپس بلائیں گے، نواز شریف نے ایسی یقین دہانی کرائی تب ہم نے چار جولائی کو آنے کی اجازت اور دعوت دی' (مائی لائف صفحہ 531)۔

ڈاکٹر پروازی کے تجزیوں میں اسطرح کی تحقیق و تفتیش سے ہمیں قدم قدم پہ واسطہ پڑتا ہے۔ مستقبل کا ادبی مورخ اگر پاکستان میں آٹو بایوگرافی کی تاریخ رقم کرے تو ہمارے زمانے کو یقیناً خودنوشت کے دورِ پروازی سے تعبیر کرے گا– ایک ایسا دور جس میں دو عقابی آنکھیں ہر نئی آنے والی خودنوشت پر مرکوز تھیں اور کھرے کھوٹے کی پہچان کا ایک مستند پیمانہ مقرر ہو چکا تھا۔
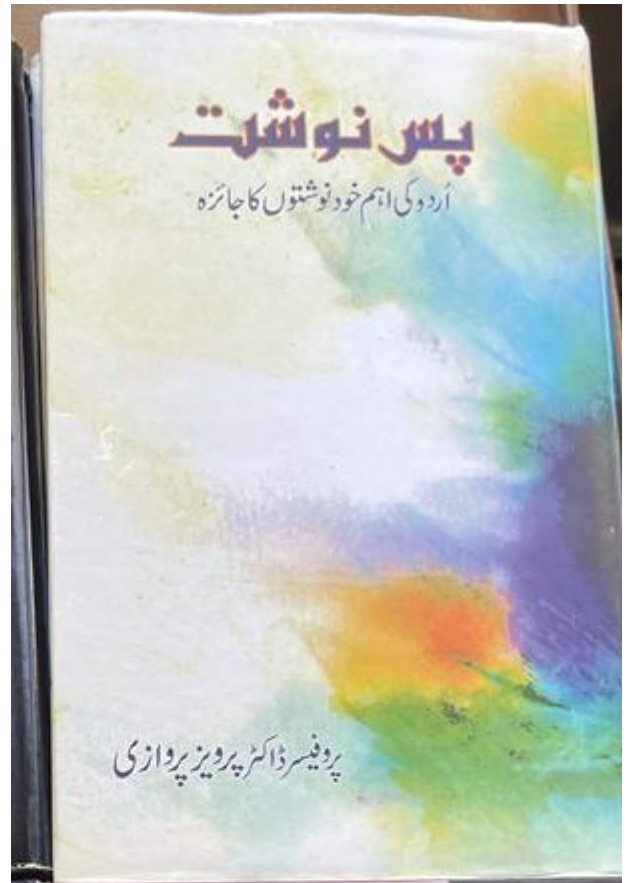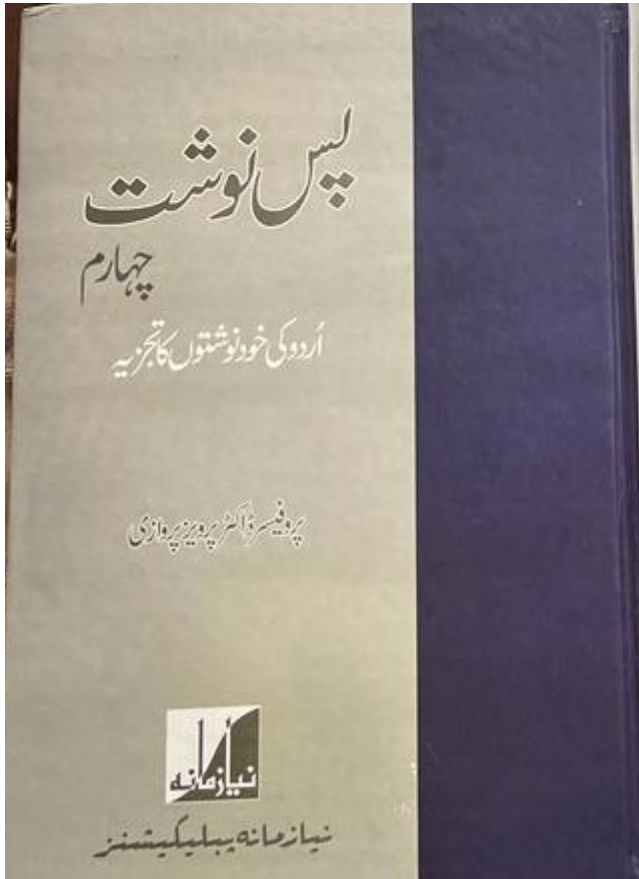
ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی

قادیان کے بزرگ

(قادیان کے بزرگوں کے بارے میں برادرم مجیب الرحمن ایڈوکیٹ کی تشویق پر جو مضمون لکھا تھا وہ نامکمل حالت میں الفضل کو بھیج دیا۔ مضمون کے چھپنے کے بعد یاد آیا کہ چھپنے والے مضمون میں صرف ہمارے گھر کے بزرگوں کا ذکر تھا۔اب اس کی تلافی کیلئے کچھ لکھنے بیٹھا ہوں۔)

حضرت میر قاسم علی صاحب

ہمارے پڑوس میں حضرت میر قاسم علی صاحب تھے۔بڑے کلے ٹھلے کے آدمی تھے۔ان کے گھر کے باہر ایک تختی پر الفاروق لکھا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں تو اتنی سمجھ نہ تھی کہ یہ کوئی علمی رسالہ ہو گا۔ہم یہی سمجھتے رہے کہ ان کے کسی عزیز کا یا بیٹے کا نام ہو گا۔میر صاحب کا کمال یہ تھا کہ سلسلہ کے مخالف اخبارات میں جو مضامین یا نظمیں چھپتی تھیں ان برجستہ جواب دیتے اور چھاپتے تھے۔مدتوں بعد اپنے روشن دین تنویر نے بتایا کہ میر صاحب کی نظموں میں ایسی برجستگی ہوتی تھی کہ زمیندار جیسے اخبار کے ایڈیٹر بھی ان کے مُنہ آتے ڈرتے تھے۔ابھی اسی سال میں نے ظفر علی خاں کی کلیات پاکستان سے منگوائی ہے اس میں ایک حصہ "ارمغان قادیان" کے نام کا علیحدہ چھپا ہوا ہے۔اس میں وہ ساری نظمیں درج ہیں جو ظفر علی خاں نے جماعت احمدیہ کے خلاف لکھی تھیں۔اس میں ایک نظم میر قاسم علی صاحب کی لکھی ہوئی نظم کا جواب ہے۔اس کا عنوان ہے فحاش زماں میر قاسم علی قادیانی۔ دو شعر ہیں۔

کہ جس کو قادیان سے دشمنی ہو
کرو سب مل کے اس کا ستیاناس

ہمارے ہاتھ سے بچنے نہ پائے
کوئی نقاش ہو یا کوئی عکاس

نقاش اور عکاس ظفر علی خاں کے قلمی نام تھے جن سے وہ جماعت احمدیہ کے خلاف نظمیں لکھتے تھے۔ یہ نظم ۱۰ دسمبر ۱۹۳۲ کی لکھی ہوئی ہے ۔اس نظم میں ہمیں تو کوئی فحش نظر نہیں آیا خدا جانے میر صاحب کو فحاش کس قصور کی بنا پر لکھا گیا ہے۔

اسی طرح ایک اور نظم ہے جو ساری کی ساری زمیندار اخبار نے نقل کی ہے اور پھر اس کا جواب لکھا ہے۔ نظم سے قبل لکھا ہے "قادیان کے ترجمان الفضل مؤرخہ ۷ نومبر ۱۹۲۱ میں ایک شاعر نے مولانا ظفر علی خاں کو یوں مخاطب کیا ہے۔

بری طرح قادیاں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ظفر علی خاں
سمجھ پہ کیوں پڑ گئے ہیں پتھر یہ کیسے فتنے اٹھا رہے ہیں
جناب محمود کو برا کہہ کے کیا ملے گا سوائے ذلت
یہی نہ جو کچھ رہی ہے عزت اسے بھی دل سے گنوا رہے ہیں
وہ اپنی مسجد الگ چنیں گے ہزار دنیا بنے مخالف
انہیں یہ ضد ہے کہ کیوں مسلماں ایک مرکز پہ آرہے ہیں
نفاق کی آندھیوں سے اک دن مٹا کے رکھ دیں گے قصر مسلم
کسی کو ملحد بنا رہے ہیں کسی کو کافر بنا رہے ہیں
وہ کانگریس پر فدا کریں گے رسول مقبول کی شریعت
وہ اپنے کاندھوں پر آج اسلام کا جنازہ اٹھا رہے ہیں
وہ کانگریس جس کا مقصد اولیں مٹانا ہے نام مسلم
اسی کی حرمت پر کٹ رہے ہیں اس کی عزت بڑھا رہے ہیں
بڑے بڑے کانگریس کے ہندو ہیں آج خون مسلم کے پیاسے
یہ گیت ہندو کا گا رہے ہیں یہ الٹی گنگا بہا رہے ہیں

اس نظم پر الفضل اخبار میں شاید لکھنے والے کا نام ہو یہاں درج نہیں مگر لہجہ بتاتا ہے یہ نظم میر صاحب کی ہے۔اس نظم کا جواب ۳۰ نومبر ۱۹۳۱ کو شائع کیا گیا جس کے چار شعر ہیں اور اپنے کانگریسی ہونے کا اعتراف ہے۔

یہ فتنہ پرداز قادیانی نئے نئے گل کھلا رہے ہیں
ادھر رقیبوں سے مل رہے ہیں ادھر ہمارے گھر آرہے ہیں
یہ ہمہمے سیرت النبی کے یہ زمزمے عشق مصطفی کے
جنہیں سمجھتے ہیں دل سے کافر انہیں کو گھر گھر سنا رہے ہیں
ظفر علی خاں کی آبرو پہ نہ حرف آیا نہ آسکے گا
خدا نے جب دی ہے اس کو عزت تو آپ کیوں تلملا رہے ہیں
وہ کانگریس کا ہے گرچہ حامی خدا نہیں ہے مگر اس کا ٹامی
یہ وہ خدا ہے کہ قادیانی گن اس کے دن رات گا رہے ہیں

مولانا ظفر علی خاں رہے نہ ان کی عزت افزائی کا چرچا رہا۔ آج ان کو جاننے والے بھی انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ ان کے اس مصرعہ کی داد دینے والا بھی کوئی کہاں رہ گیا ہوگا کہ مولانا ظفر علی خاں کی آبرو پر نہ حرف آیا نہ آسکے گا۔ اب وزیر اعلیٰ پنجاب کی سرپرستی میں ظفر علیٰ خاں ٹرسٹ بنا ہے تو کہیں جا کر ان کی تصنیفات کی اشاعت کا اہتمام ہوا ہے ورنہ ان کی آل اولاد تو سب کچھ بھول بھال بیٹھی ہے۔ اولاد کا ذکر آیا تو یاد آیا مولانا عبد المجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر نے زمیندار سے الگ ہو کر اپنا روزنامہ انقلاب شائع کرنا شروع کیا تو ظفر علی خاں نے انہیں طعنوں پر دھر لیا کہ سب ظفر علی خاں کی تربیت کی برکت ہے کہ سالک و مہر اتنے بڑے صحافی بنے بیٹھے ہیں۔ اگر انہیں ان کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو ان کی پرکاہ جتنی حیثیت نہ ہوتی۔ سالک صاحب نے کچھ دن تو ان کے طعنے سہے آخر ایک ایسا فکاہیہ لکھا کہ اب تک کسی سے اس کا جواب نہیں مل سکا۔ سالک صاحب نے لکھا یہ درست ہے کہ مدیران انقلاب کو ظفر علی خاں کے اخبار میں کام کرنے کا موقعہ ملا ہے مگر ان کی صحافت کی اصابت میں مولانا کا کوئی کمال نہیں۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو مولانا کے اپنے صاحبزادے پر ان کا فیض تربیت کیوں اثر انداز نہیں ہوا؟ زمین شور تھی یا تخم ناقص تھا۔ زمیندار کو چپ لگ گئی ورنہ زمیندار ہوا اور چپ ہو جائے۔

ہم نے تو اپنی آنکھوں سے لاہور کے YMCA کے ہال وہ جلسہ بھی دیکھا ہوا ہے جس میں مولانا ظفر علی خاں سٹیج پر بت بنے بیٹھے تھے اور خالی خالی نظروں سے سامعین کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی زبان ایک لفظ بھی ادا کرنے سے قاصر تھی۔ استغفر اللہ ربی من کل ذنب۔

ہمیں میر صاحب کا دیکھنا یاد ہے کیونکہ ان کا مکان ہمارے سکول کے عین سامنے تھا بلکہ ہماری کلاس عین ان کے گھر کے سامنے لگتی تھی۔ ان کی شخصیت کا رعب داب اتنا تھا کہ کبھی ان سے سلام کرنے کا بھی حوصلہ نہ ہوا، البتہ ان کی بزرگی کا احترام ہمارے بزرگ بھی کرتے تھے اور ہمارے اساتذہ بھی۔ بس اتنا ہی اپنا مشاہدہ ہے باقی جو کچھ ہے وہ سنا سنایا ہے۔

حضرت مولوی شیر علی

حضرت مولوی شیر علی کا ذکر گھر میں اکثر ہوتا اور وہ بھی اس حوالے سے کہ ہمارے ابا کے بچپن میں قادیان میں بڑے زور کی آندھی آئی تھی۔ ہمارے ابا بچپن میں دبلے پتلے اور کمزور تھے، اتنے دبلے پتلے کہ آندھی انہیں اڑا لے گئی۔ آندھی کے بعد حضرت مولوی شیر علی کے صحن کے تن آور درخت کے ساتھ لپٹے ہوئے پائے گئے۔ اس زمانہ میں درمیان اور کوئی عمارت نہ ہوگی۔ حضرت مولوی شیر علی کے صحن میں تو ہم بھی کھیلے ہیں۔ ہرا بھرا صحن تھا ایک دو بھینس موجود رہتی تھیں۔ ہم نے تو نہیں دیکھا مگر بزرگوں سے یہی سنا کہ مولوی صاحب اپنی بھینسوں کی دیکھ بھال خود کرتے تھے اور ان کا دودھ خود دوہتے تھے۔ یہ واقعہ تو ہماری تاریخ میں مذکور ہے کہ ایک بار کسی انگریز نے ایک دیہاتی کے ہاتھوں میں انگریزی کی ضخیم لغت دیکھ کر پوچھا تھا کہ بھلا آپ یہ کتاب کیوں اٹھائے پھرتے ہیں؟ وہ دیہاتی حضرت مولوی صا حب تھے۔ فورمین کرسچین کالج کے گریجوایٹ اور قرآن حکیم کا انگریزی میں ترجمہ کرنے والے۔

دیکھنے میں حضرت مولوی صاحب کی شخصیت بہت ہی سادہ تھی سر پر صافہ باندھتے تھے اور اونچی شلوار پہنتے تھے۔ تیز مگر باوقار چال تھی یہ نہیں لگتا تھا کہ جلدی میں ہیں، راہ چلتے ہر ایک کو سلام کہنا ان کا طریق تھا اور سلام میں پہل کرنا بھی ان پر ختم تھا۔ ہم نے کئی بار اپنے دوست سعید رحمانی سے مل کر یہ کوشش کہ گلی کی نکڑ پر چھپ کر کھڑے ہو جاتے کہ مولوی صاحب مڑیں گے تو ہم پہلے سلام کر دیں گے۔ مگر مولوی صاحب ہمیشہ پہل کر دیتے۔ ایک بار ہم نے پوچھ ہی لیا کہ ہم تو چھپ کر کھڑے تھے آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ہم چھپے ہوئے ہیں۔ مسکرائے فرمایا بیٹا میں گلی کے موڑ مڑنے سے پہلے سلام کہہ دیتا ہوں کوئی جواب دینے والا نہ ہو تو فرشتے تو جواب دیتے ہیں۔ بچوں پر شفقت بھی بہت فرماتے تھے ہماری اس حرکت پر خوشی کا اظہار فرمایا کہ ہم سلام میں پہل کرنے کوشش کر رہے تھے۔ بچوں سے ملنا ہو تو ان کے باپ دادا کا نام پوچھتے اور سلام بھجواتے۔

حضرت مولوی شیر علی صاحب، حضرت مصلح موعود کی قادیان سے عدم موجودگی میں قادیان کے امیر بھی مقرر ہوتے تھے مگر امارت کی وجہ سے جہاں ان کی مصروفیت بہت ہی بڑھ جاتی تھی وہاں فروتنی بھی بڑھ جاتی تھی۔ ایسے لگتا تھا امارت کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں، ایسی ہی فروتنی ہم نے بعد کو حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کے ہاں دیکھی وہ بھی امیر مقامی ہوتے تو ان کی عاجزی انکساری دیکھنے والی ہوتی تھی۔ کیسے اللہ والے لوگ تھے۔

بابا جی فضل محمد ہرسیاں والے

ہمارے مکان کے بالکل سامنے بابا جی فضل محمد ہرسیاں والے رہتے تھے۔ بزرگ اور بوڑھے تھے ان کے بیٹوں کی سوڈا فیکٹری تھی کاروبار تو کب کا چھوڑ چکے تھے مگر دکان میں یا دکان کے سامنے بیٹھتے تھے اور محلے کے بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھتے رہتے تھے۔ ہونٹ ہلتے رہتے ذکر الٰہی کرتے ہوں گے ہم نے انہیں کسی کو جھڑکتے نہیں دیکھا۔ جب بھی ہم ان کے گھر جاتے تعظیماً انہیں سلام کہتے اور دعائیں لیتے۔ مولوی عبد الغفور صاحب کے بچوں میں ہدایت ہمارا ہم عمر تھا بھائی بشارت بڑے تھے مگر ہمارے ساتھ کھیلتے تھے۔ چچا عبد اللہ کاموں میں مصروف رہتے

مگر سکول کی چھٹی ہوتی تو جیسے ہر ایک بچے کو گھر بھیجنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ جو بچہ بھی انہیں سکول کے بعد نظر آتا پہلے اسے گھر جانے کا کہتے۔

باباجی فضل محمد کی بیٹیاں بہوویں سب ہماری پھوپھی جی سے قرآن پڑھی ہوئی تھیں۔ اس لئے ہمیں بہت پیار دیتی تھیں۔ بہت بعد تک ربوہ آ جانے کے بعد بھی وہ قادیان کی ہمسائیگی کا پیار قائم رہا۔ ہماری استاد بہن امتہ الباری ناصر نے زندہ درخت کے نام سے اپنے خاندان کی تاریخ لکھی ہے اور خوب لکھی ہے اگرچہ ہمارے تبصرے کا ایک حصہ عزیزہ امۃ الباری کو پسند نہیں آیا، چاہتی تھیں ہم وہ حصہ نکال دیں، ہم نے نہیں نکالا وہ تبصرہ کہیں چھپنے کو نہیں بھیجا۔ جب امتہ الباری کا انقباض دور ہو گا چھپوانے کی اجازت دے دیں گی تو چھپ جائیگا۔ اس تبصرہ کے نہ چھپنے سے کتاب کی افادیت میں کوئی کمی نہیں آئیگی نہ آئی ہے۔ بس بہن بھائی کے ذوقی اختلاف کا معاملہ ہے۔

حضرت میر محمد اسماعیل

حضرت میر محمد اسماعیل صاحب کی کتاب بخار دل کی نظمیں قادیان کے ہر بچے کو حفظ تھیں۔ ان کی نعت مبارک علیک الصلوٰۃ علیک السلام تو آج بھی لوگوں کے ورد زبان ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس جیسی نعت بہت کم لکھی گئی ہے۔ ان کی آپ بیتی کا بھی بہت چرچا تھا۔ ہمارے بزرگوں کا ان سے بہت تعلق تھا۔ ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے شاید نہیں، جماعت کے ایک جید صاحب قلم کی حیثیت میں لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ ہمیں دو تین بار ان کے گھر جانا یاد ہے۔ حضرت میر صاحب بچوں پر شفقت فرمایا کرتے تھے۔ بہت بعد کو ان کے چھوٹے صاحبزادے سید امین احمد ہمارے ساتھ کالج میں رہے۔ امین کی شادی نواب محمد احمد خاں کی صاحبزادی راشدہ سے طے پائی تو ہم نے کہا لو میاں تم سید پہلے ہی تھے اب نواب بھی ہو جاؤ گے۔ امین کہنے لگا دیکھتے رہنا میں نواب بنتا ہوں یا میری بیگم درویش بنتی ہے۔ ہم نے امین کو نواب بنتے تو بہر حال نہیں دیکھا اس کی سادگی اور درویشی اسی طرح قائم رہی جیسی کالج کے زمانہ میں تھی۔ اتفاق ہے کہ ہمیں شادی کے بعد امین کے گھر ایک بار بھی جانے کا موقعہ نہیں ملا۔ اسلیے ہم اس کی بیگم کی درویشی کے باب میں کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔ اب تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں کی مغفرت فرمائے۔ آمین

شعر و سخن

پرویز پروازی

غزل

خزاں رسیدہ بہاریں ستم رسیدہ چمن
عیاں ہے دشتِ جنوں میں قدم قدم پہ تھکن

کسے سنائیں کہ دنیا ہے عشرتوں کا فریب
کسے پکاریں کہ الفت کی منزلیں ہیں کٹھن

تمہاری زلف سے باقی ہے بوئے مشکِ ختن
تمہارے حسن سے زندہ بہارِ سَرو و سمن

افق سے پھوٹی غموں کی بُجھی بُجھی سی کرن
کچھ اَور بڑھ گئی زخمِ دل و جگر کی جلن

بچھا رہا ہوں تری رہ میں آنسوؤں کی بساط
پلا رہا ہوں جہاں کو مئے سرورونشاط

غزل

دل مبتلا ہے اک وفا ناآشنا کے ساتھ
کیسی گرہ لگی ہے ہوا کی ہوا کے ساتھ

مہکا ہوا ہے صبح سے آنگن خیال کا!
آئی ہے تیرے جسم کی خوشبو صبا کے ساتھ

برسا ہے اب کے آنکھ کا بادل کچھ اس طرح
ہر نقش دل سے مٹ گیا نقشِ وفا کے ساتھ

دل خون خون ہے مگر کیا کیجئے اسے
نسبت ہے اس کو بھی کسی دستِ حنا کے ساتھ

بکھرے پڑے تھے زردرو پتے حواس کے
آندھی چلی تو لے گئی ان کو اُڑا کے ساتھ

غزل

آئی سحر تو رات کے سائے ہوا ہوئے
بس اک نظر سے سوختہ جاں کیا سے کیا ہوئے

گریاں ہوئے تو شدتِ احساس مٹ گئی
چُپ ہو گئے تو پنجۂ دستِ حنا ہوئے

پھرتے ہیں تیری یاد کی خوشبو لیے ہوئے
آوارگانِ شوق بھی بادِصبا ہوئے

ہم کارواں سے گرد کی صورت بچھڑ گئے
سَیلِ ہوانما تھے ہوا کی غذا ہوئے

اک عمر سے تھی درد کی زنجیر پاؤں میں
تیرے اسیر ہو کے ہم گویا رہا ہوئے

اجنبی

اِک زمانہ ہوا
ایک گمنام سی
راہ کے موڑ پر
دو مسافر ملے!
چند لمحے رُکے
اور پھر چل دیے
اجنبی ہو گئے

ان کے دل میں مگر
ایک بے نام سی
آرزو کی کلی
کِھل اُٹھی!
بات کچھ بھی نہ تھی

اِک فسانہ ہوا
اِک زمانہ ہوا
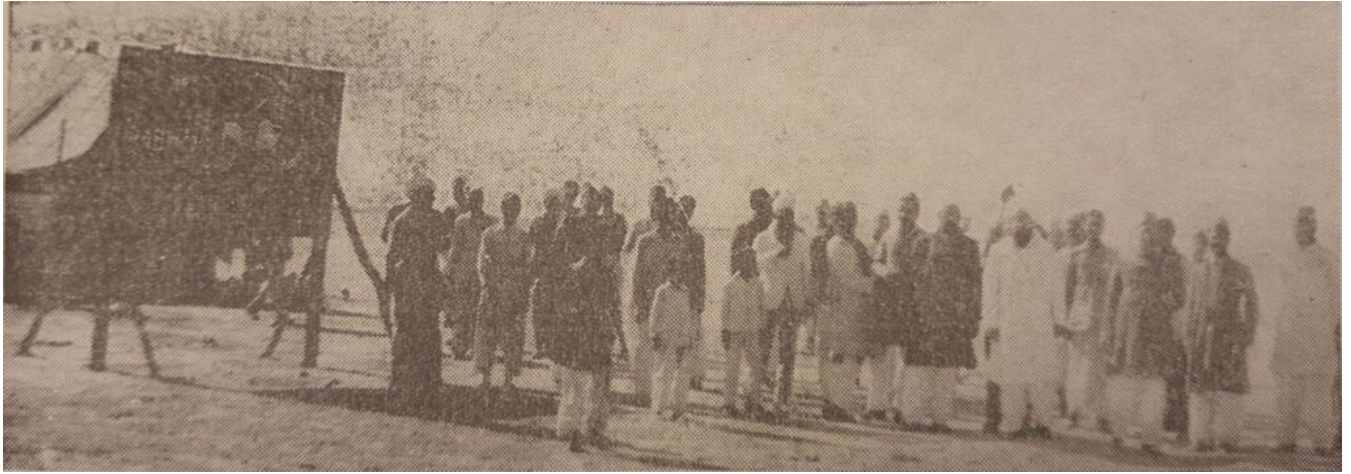
A City of Visionaries

Prof Dr. Parvez Perwazi
(Translated from Urdu by Safir Rammah)

Migration has always been an important part of human experience. Human beings resort to migration whenever faced with insecurity or lack of necessary resources to survive. The whole history of human evolution and growth is shaped by the far- reaching consequences of migrations. One such large-scale migration took place at the time of creation of Pakistan. It is considered the largest migration during the 20th century. Millions of people left the country of their ancestors to migrate to their adopted new homeland. A homeland, where they believed they would realize their cherished dream of a happy, peaceful, and free life. Hundreds of thousands of lives were lost during this exodus. Many died on their way and millions of refugees who reached Pakistan faced innumerable difficulties and went through a long period of pain and suffering that is the fate of exiles. That was my first experience of migration.

Later, when I was forced to migrate again in 1990, I expressed my feelings in an English poem "The Generation Gap". This poem, which has not yet been translated in Urdu, was widely acclaimed in the local literary circles:

Half a century ago,
My parents, gasping for freedom and fresh air, Were pleased to migrate from slavery to freedom, And settled in the land of their dreams.

Half a century later,
I, their child, was forced to leave their land of dreams,
For lack of freedom and fresh air, In search of freedom and peace,
To a land I have never even dreamt of!

The first migration marked the beginning of a new chapter in our lives. This is the story of that period. After arriving in Pakistan from Qadian, members of Ahmadiyya Jama'at scattered around the country wherever they could find refuge. However, the Jama'at had an urgent need for a center. It was, of course, not possible to find a readymade center for the Jama'at. They had to start from scratch to estab-

lish a new headquarters of the Jama'at so that they could continue their mission. It turned out that providence had already set aside a special tract of land for this purpose by keeping it barren and uninhabited for many centuries. Although situated on the bank of a river, the Chenab, this desolate piece of land was devoid of any vegetation. Dr. Wazir Agha once related to me that people were scared to travel through this isolated territory, even during daylight. Obviously, they had every reason to be afraid of this area which consisted of nothing, but a barren piece of land covered with layers of white saline and an old, deserted graveyard that was surrounded by ominous hills of black stones. All attempts to raise water from the Chenab to irrigate this land had failed in the past.

When Ahmadiyya Jama'at bought this piece of land to build a new town, Rabwah, the folks living in the nearby villages must have considered it a foolhardy adventure. They had no idea that members of the Jama'at always boldly face such insurmountable challenges. The apparent difficulty of a task, no matter how impossible it appears to be, never discourages them. Indeed, they embody this famous Urdu couplet, *'It is only the true visionaries who can see beyond the apparent impossibility of a situation. They are the ones who will build the new cities of tomorrow out of the ruin and destruction of today."*

After leaving Qadian, my family first settled down in Changa Bangial in District Rawalpindi, except my father who was arrested in India with some of his colleagues. He was eventually released in 1948 as part of an exchange of political prisoners between India and Pakistan. After his arrival in Pakistan, we moved to Rabwah. It was a fortunate turn of events for me because I was ill prepared for the final Vernacular exams that I had to take shortly. My father's duty to immediately report to Rabwah saved me from this ordeal. '

At that time, there was no school in Rabwah for children of my age. Classes for T.I. High School were temporarily held in a building in Chiniot and for Jamia Ahmadiyya in the nearby Ahmed Nagar. All houses in Rabwah were made of sun-dried bricks of mud. The city consisted of long lines of such houses. The office buildings of Anjuman were of the same type and were made up of three or four barrack type buildings that were divided into smaller rooms. Children were not allowed to enter the premises of those offices. Only a couple of times did I have the occasion to go to Anjuman' s office to fetch my father, when my mother had fallen seriously ill. She could not recover from this sickness and finally joined her Creator in Heaven. She was among the first few inhabitants of Rabwah's main graveyard, Bahishti Maqbara.

The year was 1951. I was a tenth-grade student in T.I. High School and was preparing for my Matriculation examinations that were scheduled in a few months. My father decided to admit me in the school's hostel in Chiniot to keep me away from the sadness and gloom that had engulfed our family after the untimely death of my mother. In Chiniot, I spent most of my time with Rehmani sahib's family. His wife, Sofia, was my aunt. Many other close family friends from Qadian who were settled in Chiniot, in particular the family of Sardar Misbahuldin and Sardar Nazar Baloch's daughter Tifi, also helped me get over the grief of my mother's sad departure. After the Matriculation exams, I came back to Rabwah.

In the beginning, the earlier settlers in Rabwah had to live in tents. By the time my family moved to Rabwah, mud houses had replaced those tents. Although not an eye witness myself, I have heard so many stories from Abdus Salam Akhter sahib about the time when Rabwah was a city of tents that I can clearly picture that whole scene. With a small party of other Ahmadis, he was among the first tent settlers of Rabwah. He used to skillfully paint the scary scene of their first night in Rabwah. They were huddled together in a small and flimsy tent in the middle of nowhere. The nagging fear of dark wilderness around them and nonstop howls of jackals kept them awake all night. By the way, under normal circumstances, most Ahmadis were used to living in tents because each year they had to spend three nights in tents during the annual Youth Conference.

I still remember that the official residence of Huzoor and the adjacent mosque were also built by using the same mud bricks. Huzoor used to lead daily prayers and deliver Friday sermons in this mosque. Even during the hottest days of summer, he would not only continue to lead the prayers but also never stopped his routine of spending time with the congregation in question-answer sessions after midday and afternoon prayers. I can still vividly recall that scene: Huzoor is sitting in the small *mihrab* in unbearable heat; a khadim is standing by swirling a small hand-held fan; Huzoor's shirt is dripping with perspiration; once or twice Huzoor removes his turban to get some relief from the heat. Such was life in Rabwah. For many years before the arrival of electricity, we had to bear the brunt of extreme heat in summer and extreme cold in winter without the aid of electric fans or heaters.

I also remember the day we were all devastated by the sad news of Hazrat Amma Jaan's demise. All around, people in Rabwah were stricken with grief, some crying openly and uncontrollably. For the funeral procession, very long bamboo poles were attached to the coffin. That was the first time I saw this device that allows maximum number of people to share the task of carrying the coffin on their shoulders. The news of Hazrat Amma Jaan's death was announced three times by Pakistan Radio. The exact wording of this announcement is still engraved in my memory, "We sadly announce that the widow of Hazrat Mirza Ghulam Ahmad and the mother of current head of Ahmadiyya Jama'at, Hazrat Mirza Bashir-ul-din Mahmood Ahmad, passed away at Rabwey today." I was surprised by the announcer's careless mispronunciation of the name of Rabwah as "Rabwey." Later, I learned that it was in fact the proper pronunciation because under certain conditions, Arabic words that end in 'ah" sound are changed to 'ey', a point commonly missed by even some Ahmadi speakers.

In Rabwah, houses were built on both sides of the railway track. We used to live on the same side of the tracks which is now named Muhalla Dar-us- Sadar. At that time, this section of Rabwah was known as Alif Muhalla. On the other side of the railway tracks, there were long lines of houses, called quarters. These quarters were built to accommodate Anjuman's employees. Uncle Bhambri and my friend Majid Shahid lived in those quarters. Only one railway train used to pass through Rabwah in those days, once in the morning around 6:00 am and then returning around 6:00 pm. I used to travel on this train to go to my school in Chiniot. I was accustomed to traveling on foot about the same distance to Qadian while we were living in our village. That was a pleasant walk-through green farm. Here, I did not feel like walking to Chiniot on an unfriendly terrain. As a result, I had to follow the train schedule and return home from school very late in the evening. Eventually, my father bought a used Raleigh bicycle from Nur-ul- din sahib who was a calligrapher by profession. He was very meticulous in his calligraphy and had a matching taste in bicycles. He was also very fond of fishing. As soon as he finished his daily work on calligraphy, he would rush to the river on his bicycle with all the paraphernalia of fishing. The run-down bicycle he sold to my father was probably no longer fit for his needs. My father had taken twenty Rupees in advance against his pay from his office to purchase this bicycle. I knew that he had purchased it for my daily trip to Chiniot, because there was no chance, he could get on a bicycle due to his large frame. My friend Majid Shahid who was one grade senior to me in school and had a stronger physique became my bicycling partner. He would ride the bicycle while I would comfortably sit on the carrier. Soon, we invented a "double gear" system. While climbing the steep slope of the road at the bridge, both the rider and the passenger sitting behind on the carrier would push one pedal each at the same time. With this combined force, it became easier to climb the bridge. Later we started using this "double gear" system throughout the journey so that one person would not have to push the bike alone. This system was especially helpful when we had to ride against the wind.

Only a few buses traveled on this road. Instead of petroleum, those buses were run on gas. Many times, the gas cylinders would fail to provide enough power for the bus to climb over the bridge and the engine would gasp and sputter to a stop. Passengers would disembark and begin the strenuous job of pushing the bus over the bridge. Exhausted and out of breath, they would then get back on the bus to continue their journey.

The bus drivers who traversed this road daily were all very courteous to us since many times they needed our services to help push their stalled buses. It was a narrow road and we always had to get off the road to let the buses pass. This would force us to dismount the bike since it was not possible to ride it in the sand that was piled on both sides of the road. Trucks seldom traveled on this road. Horses and horse-driven carts were used to transport all kinds of freight. Every morning, the venders of Rabwah brought fresh vegetables from Chiniot on horse wagons. Donkeys were also used to carry all kinds of loads. Now, they are used only to carry bricks or to push donkey-carts. One of my classmates, Naimatullah, was the first person to employ the services of a donkey for carrying loads. He had many customers and earned about two Rupees per day with the help of his donkey. He was never shy of bragging about his superior status as a "gainfully employed" person while the rest of us were dependent on our parents.

The offices of Tahrik-e-Jadid were among the earliest temporary office buildings that were built during my time in Rabwah. These makeshift offices, constructed with mudbricks, were in the shape of a square around an open courtyard. Generally known as the 'courtyard', these offices were later used as the boarding house for the students of Jamia Ahmadiyya. There was another building that was also known as a courtyard. A few poor families resided in this building. I used to go there quite often since the family of one of my school friends was living in that building. With the grace of God, this friend of mine is now very well off and is the head of a large family. He is settled in London. Yet, there is no change in his unpretentious demeanor. He is still the same person that I have known since his early childhood of extreme poverty. He very well remembers those days. Indeed, the first virtue of a great man is that neither poverty nor wealth affects his character and behavior.

We lived on a broad street with rows of quarters on both sides. Ours was the first house on this street. Brother Muhammad Alam, a bodyguard of Huzoor, and his father Ghulam Hussain lived in a house across the street. Brother Muhammad Ahmad Naeem and my uncle, Hazrat Moulvi Ghulam Nabi Misri, were their neighbors. Qari Muhammad Amin resided in the house adjacent to ours, and Moulana Muhammad Yaqoob Tahir in the next house. The residence of Chaudhry Ejaz Nasrullah Khan, Assistant Nazir-e-Amoor Aama, was further down on the same street. Chaudhry Attaullah sahib later took his place. At the end of the street, towards the railway station, Hafiz Ghulam Mohiuddin sahib ran a small teahouse. I often visited this teahouse to enjoy the company of Moulvi Musleh-ul-Din Rajaiki sahib who was its regular patron. Khan Mir Afghan sahib, a well-known bodyguard of Huzoor since the days in Qadian, had also opened a teahouse where he served strong 'Pathani' tea. Mr. Ceyloni ran the most popular teahouse in Rabwah. He was from Ceylon, now re-named Siri Lanka. Little was known about how he ended up in Rabwah. His tea was famous for its delicious taste and a very pleasant aroma. No one could ever figure out how he added that mysterious fragrance in his tea. He kept its recipe a well-guarded secret. A few sips of his tea were enough to make anyone a permanent customer. His teahouse was in a large tent in the backyard of a quarter. Not only that he served delicious tea, but he also took great care in keeping his teahouse, its furniture and teacups sparkling clean. Then suddenly, one day Mr. Ceyloni packed his stuff and left town. After many years, I once saw him selling tea near the District Court in Jhang. I was in a hurry and did not get a chance to ask him about what prompted him to suddenly leave his loyal customers in

Rabwah and move his business to Jhang. Besides Mr. Ceyloni's tent, there was another large tent in Rabwah. It belonged to Malik Umar Ali sahib and served as his residence. If I remember correctly, he worked in Tahreek-e- Jadid's office as Vakeel-e-Tabsheer. He created quite a stir in Rabwah in those days by marrying a German lady. This marriage remained the talk of the town for many months afterwards.

Two highly esteemed elders, Hazrat Qazi Abdur-Rahim and Qazi Abdullah lived on the next street behind our house. They were both very industrious workers of the Jama'at. Qazi Abdur- Rahim sahib supervised the construction of the new Qasar-e-Khilafat and the new central mosque of Rabwah, Al-Mubarik Mosque. The new office buildings of Sadar Anjuman and Tahrik-e-Jadid were also constructed under his supervision. I had the good fortune of benefiting from Hazrat Qazi Abdullah sahib's company for a long period of time. In his old age, he lost his hearing but everyone in the town continued to revere him the same. Another eminent personality of that time that comes to my mind is of Hazrat Mufti Muhammad Sadiq. He was very old and infirm, had a long white beard and was usually dressed in a long fluffy overcoat and green turban. He used to walk very slowly. He always carried candies in his coat pockets to distribute among children, who formed lines waiting for him on his daily route. Sometimes, after getting a candy from him, a child would run ahead and wait for him at the next comer to get a second share. Mufti sahib knew this trick, but he would just smile on seeing the same child again and would give him another candy. Hazrat Mufti sahib was one of the early companions of Hazrat Promised Messiah (a.s.). He used to deliver a speech on the life of Hazrat Promised Messiah (a.s.) during the annual gatherings of the Jama'at. His speech was always listened to with great interest and reverence. While narrating his recollections of Hazrat Promised Messiah (a.s.), his. eyes would fill up with tears. Sometimes the whole congregation was carried away and started crying with him. I have never heard anyone else speak on this subject with such authority and deep emotions.

In due time, Rabwah started changing at a fast pace. The mud houses gradually disappeared and were replaced by concrete and brick structures. When I first started working as a clerk in the hospital, it was in a small temporary building. I shared a room with the only doctor in this hospital. The Dispensary was in the next room where Brother Hafiz and his cousin Abdul Qayyum performed the duty of dispensing medicines. Our dear friend Lutfur-Rehman could be seen sitting nearby, patiently looking at some slides under a microscope· while counting *'lamphoos'* and *'palis.'* I don't know the meanings of these strange words, but I remember them clearly. Soon this hospital was shifted into a new large building. Many other changes took place in Rabwah. A bus stop was built on the main road. A large room replaced the small wooden cabin at the railway station. Still, there was no raised platform. I remember that a couple of times when Huzoor traveled on the train, wooden steps were provided for him to walk up to the train cabin. Eventually, a modem railway station with raised platform was finally built.

The annual gathering of the Jama'at was held in December each year and was always a memorable event. Temporary barracks were built to accommodate thousands of out-of-town guests. These makeshift structures were built by raising walls of dried mud. The roof was covered with dry tall grass and the floors with a thick layer of hay. I remember that one time a barrack accidentally caught fire and in the blink of an eye the whole line of barracks was engulfed in a blaze. I was terrified to see those sky-high flames. The Youth Wing of the Jama'at immediately took charge of bringing the fire under control. All the workers were in high spirits and succeeded in extinguishing the fire after a long struggle. Luckily, no one got hurt in this fire. The next day, the same barracks were again made usable by covering the roofs and the program of annual gathering continued without any disruption. After this incident, the Jama'at started renting fire engines from the municipal committees of Sargodah and Chiniof

for the duration of the annual gathering. So far, these fire engines have never been used. That was the first and only fire in Rabwah. With the grace of God, Rabwah has remained protected from all kinds of real and symbolic fires.

The post office was also in a small temporary building. Mr. Birj Lal Shaw was the postmaster. Until I found out that the correct spellings of his last name were the same as in George Bernard-Shaw, I used to wonder at the oddity of a Christian having a typical Muslim name, Shah. He was a gentleman in all respects and was always dressed in meticulously pressed khaki uniform and a hat. Every time Mirza Munawar Ahmad sahib, the head of Notified Committee of Rabwah, would pass in front of the post office, Mr. Birj Lal Shaw would remove his hat and smartly solute him. The Committee's two-room office was right next to the post office. Later on, Haji Barkatullah sahib who was an Ahmadi became the postmaster. His son, Mateeul lah Oard was my class fellow in T.I. College and we had worked together on the editorial board of *Al-Manar.* His other son, Rafiullah Dard was employed in the Telephone Department. After retirement, Haji sahib busied himself by opening his own sub post office. He was a brother or a close relative of Maulana Dard sahib.

For many years bus stop was located near Qasar-e-Khilafat and Al-Mubarik Mosque, at the same spot where now a grassy plot and two adjacent parallel lanes meet the main road. The guesthouse was conveniently located right next to the bus stop. Dar-ul-Ziafat was also at a short distance, at the same location where now there is an open ground in front of Al-Mubarik Mosque. The walls and gates around the mosque were built later, after an assassination attempt on Huzoor.

One day, during mid-day prayers, or perhaps it was afternoon prayers, the attacker joined the congregation. He somehow avoided any suspicion by the bodyguards and found a place in the first row, right behind Huzoor. He had hidden a sharp poisonous knife under his clothes. While Huzoor and the rest of the congregation were prostrating during prayers, he attacked Huzoor and caused a deep knife wound on his neck. Ghulam Murtaza sahib, the physical education instructor in our school, happened to be close by. He immediately jumped on the attacker and pinned him down. Ghulam Murtaza sahib's clothes were drenched with blood that was gushing out of Huzoor's wound. Huzoor was able to walk back to his residence.

The news of this assassination attempt spread in the town like a jungle fire and people rushed towards Qasar-e-Khilafat. When Huzoor learned that the attacker was captured, he immediately issued instructions to provide him with complete protection. This saved his life otherwise the angry crowd would have cut him in pieces. I remember that at that time a message from Huzoor was read to the people gathered at the Khilafat House. The same message was later published in *Al-Fazal.* I do not remember the exact wording of this message, but it was something like, "We should surrender to the Will of God if the time of my departure has arrived. The Jama'at should face this situation with courage. All Ahmadis should strive to uphold the tenets and discipline of the Jama'at. The success of the Jama'at is not dependent upon any individual. We all have to die one day, but the Jama'at must continue its mission." These may not be his exact words, but I am sure that this was the substance of his message.

Those were sad and gloomy days for the Jama'at. A bulletin about Huzoor's condition was issued daily. Calls were regularly made for everyone to pray for Huzoor's safe recovery. People responded by crying their hearts out while pleading Almighty God to restore Huzoor' s health. The whole Jama'at was in a state of great distress. The daily life in Rabwah came to a standstill. An air of sadness hung over the city. We were going through the same kind of trauma that we had earlier experienced at the sad demise of Hazrat Amma Jaan. Gradually, with the grace of God, Huzoor's condition began to im-

prove. Eventually his heath was fully restored, except for the lingering effect of poison on his nerves that continued to bother him till his death. The attacker was tried for the crime of attempted murder and was sentenced behind bars for five or six years.

This incident made the Jama'at fully appreciative of the true value of Huzoor's role as the head of the Jama'at. For almost fifty years, Huzoor had been providing exceptional leadership and guidance to the Jama'at. Many generations of Ahmadi' s had come to maturity during this time. Huzoor had become the personification of the whole Jama'at, as if the Jama'at and Huzoor were one and the same. It was during this time that a few hidden enemies of the Jama'at conspired to create disorder. The real perpetrators of this conspiracy, who were a few hypocrite Ahmadis in senior positions, didn't dare to come forward, while their agents started the mischief, I fully remember how this conspiracy was exposed and swiftly crushed.

One day, an announcement was published in *Al- Fazal,* admonishing the Jama'at to excommunicate Allah-Rakha and his colleagues. This alerted the whole Jama'at. The news about the activities of this group was a great shock for the Jama'at. As an expression of their sincere and unshakable trust in the leadership of their beloved leader, the whole Jama'at revived their oath of allegiance to the head of the Jama'at. Later, everyone was astonished to find out that some so-called senior members of the Jama'at were behind this conspiracy. The way Huzoor took care of this evil plot once again demonstrated that God has blessed him with extraordinary fortitude and wisdom. It was after this conspiracy that the following words were added to the oath of all auxiliary organizations of the Jama'at, "We also pledge to faithfully follow every instruction of the head of the Jama'at in all general matters." Prior to that, the oath was limited to only religious matters.

About that time, we moved to our current house in that section of Rabwah which is now called Dar-ur-Rehmat Wasti. My uncle's house was attached to our house. Both houses had a common backyard. This made the house look bigger from the outside than it really was. We lived in this house as a joint family that included my senior uncle, my parents and their six children - three sons and three daughters. I was attending the final Intermediate classes. Some parts of Rabwah were already wired for electricity, but we were still waiting for our turn. Ahmad Zaman sahib was at that time working in the electricity department. His family is now settled in Germany. Syed Sajjad Haider Shah sahib was also in the same department. His children were later among my students. His eldest son, Syed Naeem Haider, who was also one of my students, used to edit one of the popular *Digest* magazines. I haven't heard about him for a long time. I guess, something must have 'digested' him. His uncle, Syed Irshad Ali Shah was my classmate and his grandfather, Syed Sami-ullah sahib, was one of my revered teachers.

After a long wait, our house was also wired for electricity. In the beginning, we only used it for illumination at night. Electric fans were not commonly used in those days. Those difficult times didn't last forever. The day came when we installed air-conditioning units in our house. The supply of electricity was quite unpredictable in Rabwah. The first air-conditioning unit was installed at Hazrat. Mian Bashir Ahmad' s residence on the insistence of his son Mian Muzaffar Ahmad sahib. Soon after that, Hazrat Mian sahib wrote a letter to the general manager of WAPDA, Chaudhry Abdul Hamid sahib, who was an Ahmadi. Since I took the dictation of this letter from Hazrat Mian sahib, I still remember its wording, "Mian Muzaffar Ahmad had installed an air-conditioning unit in my room. I will hold you personally responsible if it is damaged due to the constant variation in the electric current supplied by your department." Mian sahib had written this letter in a light mood to make fun of WAPDA's poor service, but miraculously his air- conditioning unit remained safe and worked perfectly for many years.

Incidentally, once I was visiting the Director Finance of WAPDA in his office. Suddenly, the electricity supply got disrupted for a few minutes, damaging the air-conditioning unit in his office beyond repair. All efforts to bring this unit back to life failed. It occurred to me that if a senior executive of WAPDA cannot get proper supply of electricity, it is useless for a common customer like me to complain about this problem. I have heard that electricity continues to play the same hide and seek with the residents of Rabwah.

While mentioning electricity, I have made a sharp turn in my narration. Let me now talk about transportation facilities in Rabwah. It is hard to imagine that there was a time when there weren't even horse wagons in Rabwah. The simple reason was that no roads existed at that time. It took a while to level the streets. At a much later time, the streets were covered with crushed stones. Finally, a few paved roads were constructed in the late sixties. Only a few buses passed on the main road. These buses were powered by a gas plant, similar to the gas plant that is used by welders. It was attached on the backside of the bus, where nowadays teenagers hang on the buses to get·a free ride. Some sort of chemical was burned in these plants to create gas and provide energy to the bus engine. I have no idea what kind of chemical was used in the gas plant, since my knowledge of science is limited. Even Dr. Syed Sultan Mahmood Shahid sahib, who has authored many books on the subject of chemistry, may not be able to answer this question unless he can find a copy of one of his earlier books. I understand that after learning about my renewed interest in the gas plant of those antique buses, he is now desperately in search of that book. It would have been more prudent for him if instead of selling his Chemistry books to the last copy, he had kept at least one copy of each book in his records. This would have helped him answer such questions of historical importance, even after fifty years.

Different transport companies owned those buses. Two of them, Himalayas Transport and New Suraj Transport were in business since prior to partition of India and Pakistan. After their Indian owners had left, Fateh Muhammad Tawana M.N.A. successfully claimed New Suraj Transport Co. I don't know who the lucky claimant of Himalayas Transport was. The buses of these two companies operated on the Sargodha-Faisalabad route. United Transport was owned by the Paracha family, who were Ahmadis. Their buses operated on the Lahore-Sargodha-Bhera route. A unique feature of their Sargodha-Lahore service was its fixed travel time to arrive at Lahore. They accomplished it by making very few stops enroute. The owners of Crown cinema in Lahore operated another Transport Company, Crown Transport, on the same route. The one-way fare of their buses from Rabwah to Lahore was three Rupees and three Annas.

Then our own Mirza Munir Ahmad sahib also established a transport company by the name of Tariq Transport. Their buses were renowned for the fastest travel time between Sargodha and Lahore. Once traveling on one of their buses, I had a serious accident. It was a miracle that I survived. This happened during the sixties when I was working on my Ph.D. I used to alternately spend the first half of each week at Rabwah and the remaining half at Lahore. Qazi Mohammed Aslam sahib, and before him Hazrat Mirza Nasir Ahmad sahib, had kindly given me complete freedom to spend time in Lahore to work on my Ph.D. and had assured me that it will not affect my employment or vacation time. I adjusted my weekly schedule so that I could teach at Rabwah College from Monday to Thursday, travel to Lahore Thursday evening and return back on Sunday night. I used to take the last Tariq Transport bus at 7:00 pm from Lahore. This last bus was quite popular among the traders in our area. I was not a trader but found its schedule convenient for my needs, because it provided me the opportunity to spend a full day in the library.

Coming back to Rabwah on this bus one night, the driver was suddenly confronted by the floodlights of a truck while climbing on the slope between Alif Muhalla and the current bus station. The driver lost control and the bus rolled over a few times before coming to a stop in an upside-down position. I was sitting on the right side of the bus, opposite a heavyset trader from Mianwali who was carrying a lot of luggage. His heavy luggage was dumped on me. Luckily, I remained conscious and was able to safely crawl out of the bus. It was a horrifying scene. All passengers were in a state of shock. Many of them were wounded but fortunately there were no fatalities. I was also injured but was comforted by the thought that people from Rabwah would soon rush to the scene of the accident and would transport us to the hospital. That is exactly what happened.

Soon I was taken to the hospital. A doctor thoroughly checked me and pronounced that I had no fracture or other injury. In response to my complaint that I feel severe pain in my chest, he diagnosed that it is due to the shock of accident, and I would feel better in the morning. Next day, the pain became unbearable. I went back to the hospital. This time my chest was X-rayed. The X- ray result showed that three ribs on the left side of my chest were fractured. The doctor plastered my chest and gave me assurance that my ribs would heal in a few days. After several days of complete bed rest, I fully recovered. Even now my chest is sensitive to cold, and the cold winter breeze always reminds me of that accident.

I had previously witnessed another such bus accident in Rabwah. A Himalayas Transport bus overturned near Malik Umar Ali's residence. Some of the passengers died on the spot. I was frightened when I saw that accident. On top of that, later I myself experienced a bus accident that I have just described. As a result, the fear of bus travel remained with me until I left Pakistan. At about the same time, Malik Muhammad Ashraf sahib of Bhera, who lived in my neighborhood, died in a bus accident while traveling to Sargodha in a Government Transport bus. He was employed in one of Tabsheer offices and was a relative of my close friend, Malik Fazal Ilahi. He was the first resident of Rabwah who died in a bus accident. This accident remained fresh in our memories for a long time. Those were the days when occasional bus accidents were big news. Nowadays, bus accidents are a routine affair on Pakistan's roads and thousands of people become their victims each year.

Writing about Malik Fazal Ilahi reminds me of other clerks who were my colleagues in the Anjuman's office. Malik Fazal Ilahi and I joined Anjuman's service together. He belonged to Bhera and was a very reliable friend of mine. We were both the same age. Later he resigned from Anjuman and got admission in the overseer training school in Mong Rasul. After completing his education, he had a successful career in the Canal Department from where he retired as an assistant engineer. He is now employed in a firm in Saudi Arabia. One of my colleagues of those days was perhaps office superintendent in the same Anjuman' s office. Another colleague, Moulvi Jamil sahib, has retired. Nowadays when I go to Anjuman offices, I see many familiar faces, although I did not have a close relationship with them during my employment at Anjuman.

Hazrat Mirza Bashir Ahmad sahib passed away in the early sixties. I was in Lahore, studying in the University library when a friend gave me the sad news of his demise. We rushed to 23 Racecourse at Mirza Muzaffar Ahmad's official residence. The whole Lahore Jama'at was gathered there. A long line of viewers was slowly walking through the room where his dead body was laid down. I don't know the details of his final sickness, but it was said that he had a very high fever, which didn't come under control even after his body was soaked in ice cold water. His death was a great shock for me. I had a very close personal relationship with him. The formatting years of my life were spent under his close supervision. He had motivated me to strive for higher education. He kept a close eye on my progress in educa-

tion and would always inquire about it with great interest whenever I visited him. He was my mentor in all respects. I wish he had lived till I had completed my doctorate degree. It would have given him immense pleasure to find out that one of his pupils had achieved such a high level of education. His body was brought to Rabwah, and I followed it on· a bus. Funeral prayers were performed the next afternoon. I don't recall who led the prayers, probably Hazrat Mirza Nasir Ahmad sahib who was still the principal of T.I. College. This was maybe the first time I attended a funeral prayer that was led by him. Later, he became the head of Jama'at in 1965.

I am an eyewitness of a complete transformation that took place in Rabwah, from temporary mud houses to permanent buildings and then to modem bungalows. The first bungalow in Rabwah was built by Malik sahib Khan Noon. He had retired as a Deputy Commissioner and was a committed Ahmadi. All his life, he had wished for a son. Almighty God finally- granted his desire in his old age. He named his son Ahmad Khan Noon. After the death of his father, Ahmad Khan Noon left Rabwah. Malik sahib Khan Noon was a big landlord of Sargodha. The British Government had a custom to appoint some of the local dignitaries to administrative posts. Malik sahib Khan had joined the British Civil Service under this program. Malik Sir Feroze Khan Noon's father was also similarly employed in the British Civil Service and retired from the senior post of Commissioner. I met Malik sahib Khan Noon a couple of times. He had a serious and reserved temperament. I didn't get the opportunity to benefit from his company.

My readers may be wondering how it became possible to construct houses and bungalows on a large scale on a piece of land that was totally deprived of water. Well, sub-surface water was eventually discovered in Rabwah. The discovery of water was nothing less than a miracle. All early efforts to find water had failed when one day a certain spot was revealed to Huzoor in a dream, and he was told that *"Water will flow under your feet."* The next day Huzoor instructed them to bore at the same spot that he had seen in his dream. This time, water was successfully found. The first tube well in Rabwah was later installed at the exact same spot, which is at one comer of Hazrat Mirza Munawar Ahmad's house. Like the very first mosque in Rabwah that still stands in the lawn of Fazal-e- Umar Hospital, this tube well has also become a memorial. Soon after the first discovery, sub- surface water was found all over Rabwah. It was not possible to populate Rabwah without the discovery of water. In the beginning, at most places water was salty to the point of being bitter and was not suitable for drinking. Drinking water was supplied from AhmadNagar. Nowadays when clean water from the river is supplied to the whole city, it is hard to imagine a time when people in Rabwah had to rely on salty water for their daily needs. Over time, the content of salt in the sub- surface water in most areas has decreased and in many places water has become drinkable. For example, water in the Darur-Rahmat area was of a better quality since the beginning, but slowly the water quality in Dams-Sadar and many other areas has also improved. In those days, installing a hand pump was a very challenging job because water could only be found at a great depth. The installers, mainly Qureshi Fazal Haque and his family, worked very hard at the daunting task of putting in hand pumps in almost every house in Rabwah. Perhaps as a reward for their hard work, the sub-surface water has now risen to a reasonable level.

Eventually, tube wells were installed in Rabwah. I remember that during the construction of T.I. College's new building, water could not be found in or around the college grounds. A tube well was finally installed at quite a distance, on Mr. Justice Muhammad Islam Bhatti's property, from there water was supplied to the construction site. Besides such difficulties, the college building was successfully completed, and T.I. College was shifted from Lahore to Rabwah. This tube well still provides sufficient water for the college building and for hundreds of students in the college hostel. On a lighter note,

hand pumps in those days had an advantage over tube wells. During the summertime, hand pumps produced almost boiling hot water that could be used to make tea. Let me give a personal example. We had connected a pipe to our hand pump to carry water to the bathroom. Once a friend of mine, who had a great sense of humor, was visiting us from Lahore. On a hot summer day, he entered our bathroom to take a bath. A few minutes later he called our servant and asked him to bring a cup and tea leaves. The servant was perplexed to hear this strange order. But he was again firmly instructed to hurry up and get a cup and tea leaves for him. The servant conveyed this request to my wife, who was equally surprised and asked me to check on the wellbeing of my friend. She was afraid that he might be disillusioned due to the extreme heat. I went to the bathroom door and politely asked him to explain why he needed a cup and tea leaves in the bathroom. He replied, "forget it, I don't need it now. When I first opened the faucet, the water was boiling hot. I thought to take advantage of it by making a cup of tea and saving your wife from this trouble". This was the type of water that we had to live on. Current residents of Rabwah cannot imagine the troubles we had to go through. They now enjoy a continuous supply of clean water from the river that stays cold in their water tanks. At any rate, the discovery of water at Rabwah was an incredible achievement. People were truly astonished at Jama'at' s miraculous success in exploring water in Rabwah. Previously, even after employing the best available technology at a great expense, others had failed to find a single drop of water there. I am sure they can't figure out the secret recipe of the Jamaats' success. I know this recipe but there is no point in disclosing it because very few people can use it. Midnight prayers and pre-dawn supplications are some of the ingredients of this recipe for success. These key ingredients have become scarce these days.

Although hand pumps were installed in every house, most of the people had to get water from a few public hand pumps that produced drinkable water. For example, in the general area of Anjuman and Tahrik offices, the water was too salty for consumption. Residents of that area had to hire water carriers to bring water from Darur-Rehmat Wasti. We all learned to appreciate the value of clean and drinkable water. In some areas the quantity of various kinds of salts in the water was very high. We used to jokingly say that the government of Pakistan is unnecessarily wasting money and resources on importing heavy water for its research on Atomic Energy when it is available at no cost at Rabwah. A special quality of this salty water was that although it would wash the dirt out of one's hair, its salty residue would make the hair sticky and impossible to manage. In spite of all such difficulties, the population of Rabwah kept on growing. The supply of water became abundant and slowly greenery started to appear everywhere. These days, Rabwah is covered with all kinds of lush green plants and trees. Advertisements of Gulshan-e-Ahmad Nursery regularly appear in *The Daily Al Fazal.* These advertisements underscore the miraculous transformation of this land where a single blade of grass had not grown for centuries. Most of the residents now maintain a small garden in their backyards. The new campus of T.I. College was built on the outskirts of the town on comparatively fertile soil, but no one could have imagined that someday a garden full of fruit trees would be grown here. I remember the contractor of guava trees of this garden. Guava was also produced in a neighboring village, Kot Ameer Shah. To distinguish his fruits from his competitors, he had invented a slogan, "Come and buy my guavas. They are university graduates.11 The new campus of T.I. College was commonly referred to as a university, reflecting the high hopes and wishes of people for this institution. I am confident that, with the grace of God, one day this wish will become a reality. In fact, if the government had not nationalized T.I. College, it would have become a university by now. Our dear late brother Naseer Khan had dedicated himself to the development of this college and had loved it more than his life. One can still feel his presence in every corner of the building.

Throughout the year, many out-of-town guests used to visit Rabwah. Hakim Fazal-ul-Rehman sahib was the supervisor of the guest house and Dar-ul-Ziafat. He had spent many years in Nigeria. He was a very handsome man, and his forceful personality commanded a lot of respect. He used to carry a sturdy cane. A few beggars always appeared during mealtimes. He served them food in the same manner he served his other guests. Someone once mentioned to him that if he continued to serve food to these beggars, all the beggars of surrounding areas would start gathering at Dar-ul-Ziafat. He smilingly pointed to his cane and said, "Don't worry. Why do you think I carry this sturdy cane?" In reality, no one had ever seen him threatening a beggar with his cane, neither did he ever refuse to serve them food. He justified his generosity by saying that he was simply following the practice of the originator of this Dar-ul-Ziafat, Hazrat Promised Messiah (a.s.), and had no right to change it. Dar-ul-Ziafat was always full of guests. A dish of lentils for lunch and meat with turnips or potatoes for dinner was the standard menu that had remained unchanged for a long time and may still be the same. When T.I. College was under construction, Hazrat Mirza Nasir Ahmad sahib used to make a quick stop at Dar-ul-Ziafat on his way to the construction site. After a hurried meal, he would get back on his bike and rush to the college to supervise the construction work. I once had the occasion to watch him taking his meal at Dar-ul-Ziafat. He would partake of whatever food was available and was always in a hurry to get back to work. I have similarly observed the current head of the Jama'at at Dar-ul-Ziafat. During the annual gatherings, he used to supervise the work at Dar-ul- Ziafat, prior to his election as the head of the Jama'at. At mealtime he would sit next to an oven and eat his meal while at the same time watching the process of mass production of baked breads. His simple 'working meal' mostly consisted of just baked bread. He didn't care much about curry or other food if it was not readily available.

When Dar-ul-Ziafat was shifted to a new building, Mirza Azam Beg, a newcomer to Rabwah, was appointed its supervisor. He couldn't stay at this job for too long. Perhaps he needed some time to learn his way around and adjust in the new atmosphere. These days, Munawar Javed sahib is ably managing Dar-u.1-Ziafat. I wonder where he learned his excellent administrative skills. There were certainly no training facilities for managing Dar-ul- Ziafat in Mughalpura, Lahore, where he belongs. Although, it is famous for its railway workshop. At any rate, he has proven to be a man of extraordinary capabilities.

I should stop my narration here before I begin the lengthy subject of other towering figures of Rabwah. Finally, I must say that I feel privileged that my articles are read with great interest. This encourages me to continue to write while I can. Who knows what will happen tomorrow? As Ameer Minai once said, "O Ameer, don't hesitate to open up your heart and share its pains and sorrows while you are surrounded by the love and attention of your friends. Who knows when the times will change, and they will no longer care for you."

THE MAN WHO LOVES COBRAS

(A Chapter from Steven Freygood's book 'Heretics - Courageous Muslims For A Better World')

There is, I believe, a law of nature that reads: "Where There Be Small Frogs There Also Shall Be Small Boys and Girls!" It was certainly true when Muhammad Sharif Khan was growing up in an Indian village in the 1940's; he loved to join the rest of the gang on a hot July afternoon to head for the fields and collect frogs' eggs and tadpoles. I should point out that this was not, strictly speaking, a sport, a hunt for food, or a persecution of frogs. It was and always will be a childhood effort to understand the great Mystery of Life. I know for I, too, was one of them, only on the other side of the world.

The idea was to put them into little ponds or bowls at home, watch some of the eggs hatch, and observe the amazing spectacle of tadpoles swimming about. I'm a bit vague about what we did then, but it probably wasn't very nice for the tadpoles. Like most children I went on to think about other things; Dr. Khan was ultimately inspired to stalk bigger game.

His father was a medical doctor and, like many a proud father encouraged his son to do the same in life. In fact, Muhammad did try to fulfill his father's wish by heading for medical school. Unfortunately for their ambitions, however, standards of medicine in India, and later Pakistan as well, were and still are very high. To become a doctor one had to study the sciences; those sciences include physics, and physics requires a sound grasp of mathematics. Dr. Khan confesses, sadly, that he never was any good at math.

He was, however, an excellent student of biology - the best in fact. He won a gold medal for his master's thesis. The subject of that thesis, as if fate was lying in wait all of his life - Bufo Stomaticus, the Indus Valley Toad - and not just any old toad (which looks like a lumpy rock) but the unofficial national amphibian of Pakistan!

I have no idea if my country has a national toad and must admit I laughed at the idea of a grown man in pursuit of toads. Understandably Dr. Khan was indignant. At the time, he agreed, his friends were also vastly amused to find him still searching the ponds and puddles around the city always on the lookout for

these creatures - just as he did when he was a boy. But he points out, rightfully, that none of us who mock him have thought about the matter very carefully. In a country that depends heavily on agriculture, especially a country with a fairly mild climate, insects and other pests can be devastating to the economy. Frogs and toads, lizards and snakes, he reminded me, are the cheapest, probably the most effective, and definitely the safest form of pest control! In fact, he decided that these croakers are so important that he went on to earn his doctorate on the same topic.

Well, he is willing to grant that some reptilian pest control is not entirely safe. Pakistan is blessed or cursed with 76 species of snake, nine of them venomous. Then there is the Pakistani crocodile who isn't a jolly friend either; fortunately few Pakistanis meet them - venomous snakes are quite horrible enough. Every year in the United States about five people are killed by snakebite. In Pakistan, the number is said to be 8,200 annually.

In my opinion, it is not so much that people are bitten by snakes that is scary, but the reason they're bitten. Farmers have to work in the fields - it is what farmers do even at night. During the monsoon those fields are frequently inundated, making it impossible to see what is underfoot. Snakes are at their most active at night, but the floods often drive them out of their holes at any time of day. If you want to imagine the real horror movie, though, imagine that flooding may drive those snakes right into your house!

His interest in life was reptiles, but his duty to the Ahmadi Community led him to their administrative center in the town of Rabwah where he became a schoolteacher in biology. To outsiders like me, this may seem like a demotion, underutilizing a fine brain, but I've never heard Ahmadi Muslims complain about any assignment - and when you think about it , those were lucky students indeed to have a man with so much enthusiasm teaching a life science course that can easily be lifeless. He was even named Zoologist of the Year in Pakistan (2002). Nor did he give up his hunting, but now turned his attention to the fearsome Naja. To the world this beast is called Cobra - to the locals, it has a more pleasant sounding name - Spoon Snake. Everywhere the animal is treated with respect but in countries like Pakistan folk also appreciate that without the cobra they might well be knee-deep in rats and mice. As I said earlier a mixed blessing and curse.

No doubt you are wondering about the purpose of my story about this herpetologist. Well, after listening to all these fascinating anecdotes and statistics, I did finally get around to asking - what snakes have to do with religion. I reminded him that snakes are widely despised by most people I know - even identified with evil by some - the Devil to be precise. I could practically hear him rubbing his hands together in glee. The problem with non-Muslims, he lectured, not without some self-satisfaction, is that the Bible says that snakes are evil. In the book of Genesis Satan takes the form of a snake, after all, who tempts Adam and Eve to eat something they were not supposed to eat. It was never an apple by the way - in the Bible, the 'forbidden fruit' is never named. Some years ago I learned it was a pomegranate - a bit of useful folklore I picked up in Uzbekistan.

Islam, it seems, has a different point of view about snakes. According to Dr. Khan, there is a saying of the Prophet (PBUH) concerning snakes. In this story, the Prophet is staying with his followers in a cave and reciting from the Quran when suddenly a snake arrives. One of the companions starts to look around for something to kill it, but the snake is very quick and hides among the rocks. The anxious men go to hunt it down, but the Prophet says 'Stop! Stop! Don't kill it! It has done nothing to harm you so why do you want to go after it? In the Holy Quran it says stay away from harmful creatures, don't kill them." Now I haven't read this story for myself but that is the way the scientist told it to me - and he definitely knows his snakes and their lore.

According to the custom of the Ahmadi Community Dr. Khan eventually retired as a schoolteacher and moved to America where he lives today in Pennsylvania. I couldn't resist teasing him a little; wasn't he

bored living in a country that is, from a snakey way of looking at it, not all that exciting? He stopped for a moment and then brightened up. "I first moved to Florida," he said, "and they now have pythons there you know." At first, I thought he was having a joke at my expense, but I just looked it up. Either by accident or mischief one of the largest snakes in the world, the Burmese Python, at up to nineteen feet, has made its home in the Everglades, a threat to a lot of the local wildlife. Official python hunts have been organized - with poor results.

At last, I couldn't take his evasions anymore. "All right, Dr. Khan. Never mind what your religion says, nobody particularly wants to be friends with a cobra. Why do you obviously love them?"

"They're very bold!" he answered promptly, proudly, and with a chuckle. But after a long pause for reflection, no doubt weighing what was going on in my head, he added, "But no human has ever been attacked by a cobra you know."

This, I thought, is going too far; the snakes are famously nasty, intelligent and malicious.

"It's true," he said, "the cobra only bites a human being in defense. If you go away, then it will go away. 'You mind your business; I mind my business!' That is what it says." At this, he laughed with pleasure at my discomfort.

I learned a lot about snakes. I wondered if this cheerful old scientist had not also given me some insight into the Ahmadi Muslim attitude toward their own enemies.
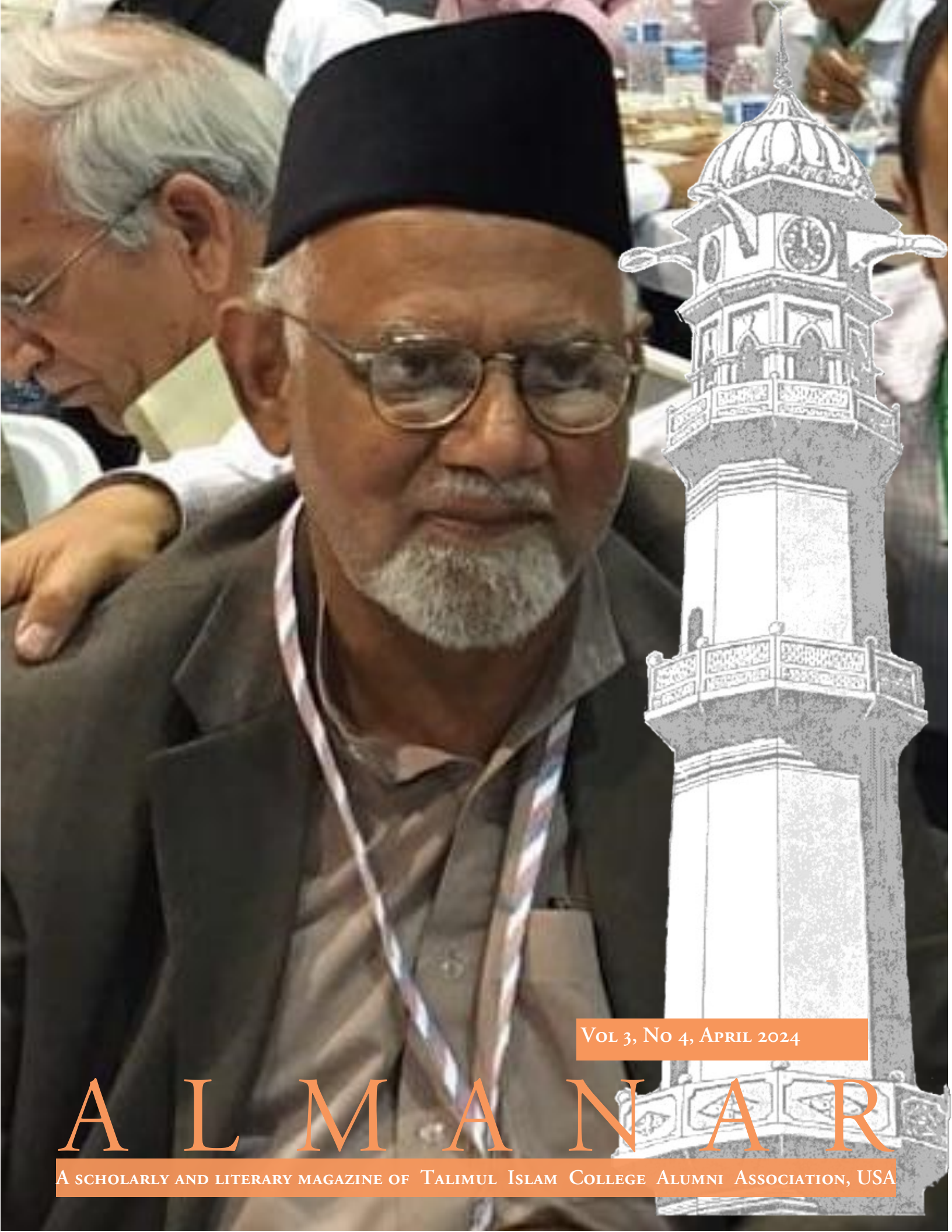
Vol 3, No 4, April 2024
A L M A N A R
A scholarly and literary magazine of Talimul Islam College Alumni Association, USA